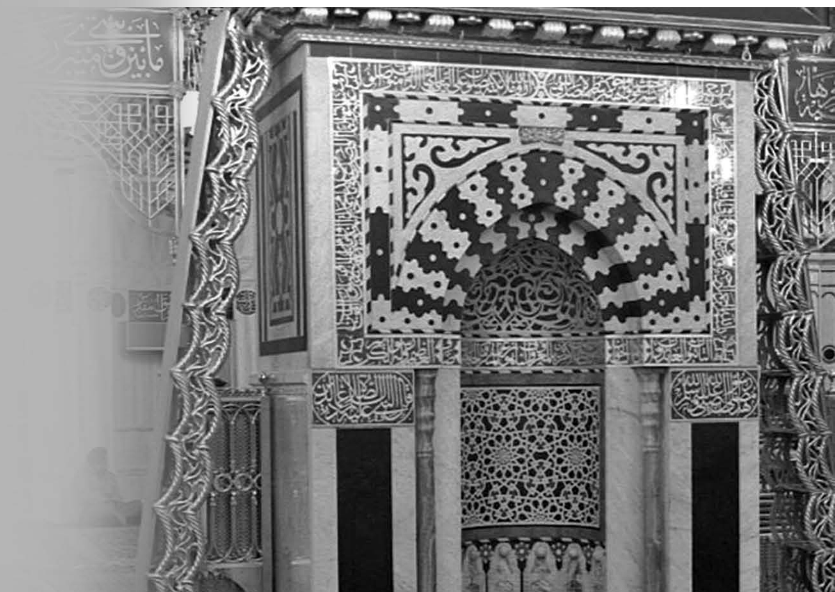
اشارات
سیرت پیغمبر انقلاب ﷺ



حکیم الاسلام امام انقلاب
مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اشارات سیرت پیغمبر انقلاب ﷺ

نبی کس کو کہتے ہیں؟

جاننا چاہئے کہ مفہمین (یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے) کے بہت سے اقسام ہیں اور ان کی لیاقتیں اور قابلیتیں بھی جدا جدا ہیں۔ انہی میں سے اللہ تعالیٰ نوعِ انسان کے لئے رہبر اور رہنما مقرر کرتا رہتا ہے۔ جب اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ ان میں سے ایک کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجے اور اس کو لوگوں کے تاریکی میں سے نکال کر روشنی کی طرف آنے کے لئے سبب بنائے تو لوگوں پر یہ فرض کرتا ہے کہ دل اور جان سے اس کی تابعداری کریں۔ اور اسی کے لئے اس دنیا سے باہر کی مخلوق یعنی ملائکہ کی اُونچی جماعت میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ جو آدمی اس کی تابعداری کرے گا اس سے ملائکہ راضی ہوں گے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے دشمن ہو جائیں گے اور اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔ جب اللہ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے اور ان پر اس بھیجے ہوئے انسان کی تابعداری کرنا لازم ٹھہراتا ہے۔ اس بھیجے ہوئے بزرگ کو جس کی تابعداری کرنا لوگوں پر لازم ہے نبی کہا جاتا ہے۔

اللہ والوں کے اقسام

اوپر گزر چکا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے ان کے بہت سے اقسام ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی حقیقت سمجھنے میں کمال کو پہنچ چکا ہے۔ یہی نبی کی شان ہے)، کوئی حکیم ہے (یعنی اللہ کی بادشاہی میں جو حکمت رکھی ہوئی ہے وہ اس کو سمجھتا ہے) کوئی "مؤیّد بروح القدس" ہے (یعنی انسانیت کو کمال تک پہنچانے کے لئے جو کام اس پر رکھا ہوا ہے یا اس نے اپنے اوپر لیا ہے اس میں اس کی مدد روح القدس سے ہوتی رہتی ہے)، کوئی لوگوں کو راستہ دکھانے والا "ہادی" اور ان کو پاک کرنے والا "مزکی" ہے، کوئی امام (یعنی قوموں کا رہنما) ہے۔ کوئی مُنذِر (یعنی کاموں کے نتائج کی پہلے سے خبر دینے والا) ہے۔

سب سے بڑا نبی کون ہے؟

انبیاء میں سب سے بڑی شان والا وہ نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کے ساتھ دوسری اقوام کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجا ہو۔ پھر وہ نبی اپنی قوم کو اندھیروں میں سے روشنی کی طرف نکالنے کا سبب ہوگا اور اس کی قوم دوسرے اقوام کی رہنما بنے گی۔ یہ دونوں باتیں محمد رسول اللہ ﷺ میں موجود ہیں۔ پہلی بات کی طرف سورۂ جمعہ کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشاد ہے۔ ان دونوں آیتوں کے معنی یہ ہیں "اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کے لئے بھی (اس کو بھیجا ہے) جو اب تک اُن (پہلوں) سے نہیں ملے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔" دوسری بات کی طرف سورۃ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اشارہ ہے، اس آیت کے معنی یہ ہیں "تم اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر کتاب والے ایمان لاتے تو ان کے لئے بہتر تھا۔ کچھ ان میں سے ایمان والے ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں۔" اور مندرجہ ذیل احادیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

☆ حدیث: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (لوگوں کے لئے) آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور ان پر تنگی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا (یعنی اُمتِ محمدی کے افراد بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بھیجے ہوئے ہیں جس طرح انبیاء علیہم السلام کو بھیجا جاتا ہے)

علاوہ اس کے رسول اللہ ﷺ میں علم کے وہ سب اقسام موجود تھے جو جدا جدا ان لوگوں میں موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے جو انبیاء تھے ان میں سے کسی کو ایک قسم کا علم تھا۔ کسی کو دو قسموں کا۔ لیکن علم کے تمام اقسام رسول اللہ ﷺ کے سوا دوسرے کسی میں بھی نہ تھے (یعنی انبیائؑ، حکماء اور جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ رہنما اور اماموں کے جتنے بھی جدا جدا علم ہیں، علم کے وہ سب اقسام ہمارے نبی کو حاصل ہیں)۔

نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟

یہ بھی جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت رسولوں کو بھیجنے کی تب خواہش کرتی ہے جب رسولوں کے بھیجنے میں کسی قسم کی بھلائی ہو۔ اس بھلائی کو اللہ غیب دان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کو ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ اسباب رسولوں کے بھیجنے کے وقت ضرور پائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقت کسی نئی حکومت (یعنی نئے نظام حکومت) کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہوگا۔ پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم

کرے گا۔ اور پرانی حکومت برباد ہو گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد ﷺ کو اس کام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ کہ قیصر و کسریٰ کی سرمایہ دارانہ (یعنی سرمایہ پرستانہ) اور ظالمانہ حکومتوں کو مٹا کر خلافت الٰہی کی عادلانہ حکومت قائم کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت

جب ہر قوم (ملت) کا دین اور دھرم جدا ہو گیا اور ہر ایک قوم نے خاص طریقے اختیار کر لئے اور ان رسومات اور طریقوں کو قائم رکھنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ پہلے زبان کے ساتھ انہوں نے جھگڑے کئے اور اس کے بعد اپنے مخالفین پر غالب آنے کے لئے اپنے ہتھیار اُٹھا کر ان سے جنگ بھی کی اور ان میں ظلم پھیل گیا۔ اور کتنے کام جو ان کو کرنے تھے ان کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور ہر جماعت نے دوسری جماعت پر لعنت کی۔ اور ان کو برا سمجھ کر ان کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور قوموں کے آپس میں جھگڑے کے سبب حق چھپ گیا۔ تب ایک راہِ راست پر چلنے والے امام یا پیشوا کی ضرورت پڑی جو تمام جماعتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا حق پر چلنے والا خلیفہ (اللہ کا نائب) ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے (یعنی یہ پیشوا مختلف جماعتوں کو ملا کر ان کو ایک جماعت بنائے گا)۔ یہ امام (پیشوا) جو جدا جدا جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائے گا اس کو چند اصولوں پر چلنا ہو گا۔ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہِ راست کی طرف بلائے گا۔ اور اُن (کے اخلاق) کو پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا۔ اس کے بعد ان سے ایسا کام لے گا جیسا اپنے اعضاء سے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کو لوگوں کی ہدایت کے لئے جدا جدا ملکوں میں بھیج دے گا۔ اور سیدھے راستے پر نہ چلنے والی دُنیا سے جنگ بھی کرے گا۔ یہ تیسرے فائدہ میں بیان کی ہوئی آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے معنیٰ ہیں۔

اس پہلے اصول پر امام کو اس لئے چلنا پڑے گا کہ اس اکیلے امام (پیشوا) سے دنیا کی بے شمار جماعتوں کے ساتھ مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اور گمان بھی یہ ہے کہ سیدھے راستے پر چلانے کے لئے جنگ کے بڑے ساز و سامان اور پوری فوج کے سوا (جن کے حاصل کرنے کے لئے نبی (امام) کی عمر کافی نہیں ہے) وہ دوسری جماعتوں کی تابعداری قبول نہیں کرے گی جیسے کہ اس وقت کے موجودہ ادیان والوں (یہود، عیسائی اور مسلمانوں) کے شروع زمانہ میں ہوا۔ کیونکہ ان میں سے جو لوگ ابتدا میں اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے۔ وہ بالکل تھوڑے تھے۔ اس نبی کے بعد وہ آہستہ آہستہ طاقت ور ہوئے اور اقوام کی ہدایت کا سبب بنے اور حق کے لئے انہوں نے لڑائیاں کیں۔

رسول اللہ ﷺ کے وقت میں ملک کی حالت اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟

جن ملکوں کی آب وہوا معتدل ہے (جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہے) وہ ملک رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کے وقت دو بڑے بادشاہوں کے قبضہ میں تھے۔

۱۔ کسریٰ (ایران کا بادشاہ) جس کا عراق۔ یمن۔ خراسان اور ان ملکوں کے ارد گرد والے ملکوں پر قبضہ تھا، ماوراء النہر سندھ اور ہندوستان کے بادشاہ بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔

۲۔ قیصر (روم یا یورپ کا بادشاہ) جس کا شام، روم اور ان ملکوں کے ارد گرد والے علاقوں پر قبضہ تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے ملک بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔ پس ان دونوں بادشاہوں کو شکست دینے اور ان کے ملکوں پر غالب آنے کے یہ معنٰی ہوں گے کہ جس نے ان کو شکست دی اس کا تمام پر غلبہ ہو گیا (اُمتِ اسلامیہ نے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کو فتح کر کے گویا روئے زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیا)۔ اس کے علاوہ ان دونوں بادشاہوں کی عیش و عشرت کی عادات ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئی تھیں پس ان عادات کے بدلنے اور ان عادات سے لوگوں کو روکنے کے یہ معنٰی ہوں گے کہ گویا تمام ملکوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ان عادات کو چھوڑ دیں (ورنہ ان پر تباہی آئے گی)۔

لیکن جن ملکوں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کا مزاج معتدل نہیں ہے ان کا انسانی نوع کی اصلاح میں کوئی خیال نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ٹیڑھے راستہ کو سیدھا کرے اور لوگوں کے لئے ایک ایسی جماعت (امتِ اسلامیہ) پیدا کرے جو ان کو اچھے کام کا حکم کرے اور بُرے کام سے روکے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلے تب یہ بات اس پر موقوف ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کی حکومت برباد کی جائے۔ اور ان کی پیدا کی ہوئی بُری عادتوں کو درست کیا جائے کیونکہ ان کی پیدا کردہ حالت نے معتدل مزاج ملکوں میں گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے برباد ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خبر دی کہ کسریٰ برباد ہو گا اور اس کے بعد کوئی بھی کسریٰ پیدا نہ ہو گا اور قیصر برباد ہو گا اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر پیدا نہ ہو گا۔ اور تمام دنیا کے باطل کو مٹانے والا (قرآن کریم) اللہ کی طرف سے نازل ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عرب کے باطل عناصر کو رسول اللہ ﷺ اور اس کے صحابہ کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔ اور پھر اسی عرب کے ہاتھوں سے قیصر اور کسریٰ کے باطل کو مٹائے گا اور باقی ملکوں کے باطل کو ان دونوں بادشاہتوں کے رہنے والوں کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔

مہاجرین اولین اور انصار سبب بنے قریش اور قریش کے ارد گرد رہنے والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام فتح کرایا۔ اس کے بعد عراق اور شام والوں کے

ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے فارس اور روم فتح کرایا۔ پھر ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے ہندوستان وترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔ گویا کہ یہ کام ایک مکان کی طرح ہے جو دیواروں پر کھڑا ہوتا ہے اور دیواریں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا چھ فوائد سے رسولوں کے بھیجنے کی حکمت بھی سمجھ میں آ گئی اور یہ بات بھی کہ رسول اللہ ﷺ کے آنے سے جو نتیجہ ظاہر ہوا وہ قرآن پر عمل کرنے سے ہوا۔ پس اس تمام نتیجہ کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہئے اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے قرآن کو نازل کیا گیا ہے۔ (یہ چھ فوائد امام ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے لئے گئے)۔

☆

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا اصل مول متہ کیا تھا؟

رسول اللہ ﷺ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ خود ابراہیمی ملت کو ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے اور وہ بھی ابراہیمی ملت کو زندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اسرائیل (یعقوب) بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کی نظر ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پڑتی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۵ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (سورہ مزمل۔ ۱۵)

(یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک گواہی دینے والا رسول بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا) اس آیت میں مذکورہ بالا بات کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

تمام شریعتوں کا اصل، حظیرۃ القدس (اس جہان کا انتظام کرنے والی مقدس مجلس) میں موجود ہے۔ پس جن بزرگوں کا تعلق حظیرۃ القدس سے ہے وہ ہر شریعت کو وہاں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو وہاں سے معلوم کرتے تھے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی اقوام تک دین حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟

رسول اللہ ﷺ نے عرب کے سوا تمام دنیا کو اس طرح دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ توراۃ اور قرآن کی تعلیم ایک ہی ہے۔ اگر تم کو ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کی تعلیم پر اعتراض ہے تو تم ان دونوں کتابوں جیسی تعلیم پیش کرو۔ اگر تمہاری تعلیم توراۃ اور قرآن کی تعلیم سے زیادہ رہنما ثابت ہوئی تو میں اس کی تابعداری کروں گا۔ لیکن خاص عرب قوم کو صرف اکیلے قرآن کی تعلیم کی دعوت دیتے تھے

۔ قرآن اور توراۃ کی تعلیم کے بارے میں قرآن نے جو اعلان کر رکھا ہے اس کو سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴ سے ۵۰ تک دیکھنا چاہیے۔

۳۔ دینِ حنیفی کی دوسرے ادیان سے برتری

اس وقت مسلمانوں کے سوا زمین پر جتنی بھی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک حنیفی (یعنی یہودی اور عیسائی) ہیں جن کے پاس تورات ہے، دوسرے صابی ہیں پھر صابی مذہب والوں کے کئی اقسام ہیں: (۱) ایران کے مجوسی، جن کے پاس زردشت کی کتاب ہے (۲) ہندو۔

ہندو دھرم والوں کی پھر دو جماعتیں ہیں: (۱) برہمن، جن کے پاس وید ہیں (۲) سمنی، جن کے پاس بُدھ کی نصیحتیں اور احکام ہیں۔ برہمنوں کی مثال ہمارے پاس یہودیوں جیسی ہے اور بُدھ دھرم والوں کی مثال عیسائیوں کی طرح ہے۔

حنیفی اور صابی مذہب والوں کے سوا تیسرے وہ لوگ ہیں جو عقل اور فکر سے سوچی ہوئی باتوں پر چلتے ہیں جن کے مراکز یونان اور روم ہیں۔ انہوں نے جب کبھی کوئی بادشاہی قائم کر کے قوم کو اکٹھا کیا ہے اور اس لئے ان کو دنیا کے قوانین سے کسی اونچے قانون کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے اہلِ کتاب کے قانون میں سے جو قانون ان کی رائے کے مناسب ہوا ہے اس کو لیا ہے اور اس کے بعد یا تو کسی (ڈکٹیٹر) بادشاہ کی طاقت سے مدد لی ہے یا آسمانی ادیان میں سے کسی دین کی طرف انہوں نے رجوع کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا ہے۔

زردشت ایرانیوں کی کتاب، وید اور بدھ دھرم والوں کی کتاب یہ سب کتابیں توراۃ کے درجہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس بات کو مذکورہ بالا مذاہب والے بھی مانتے ہیں۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا جماعتوں میں سے کسی جماعت کے پاس بھی تورات جیسی کتاب نہیں ہے جس میں انبیاء سے لیا ہوا قانون جمع کیا ہوا ہو۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین کسی زمین یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ روئے زمین کے تمام نوع انسانی کے لئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمام نوع انسانی کے فائدہ کے لئے کوئی عام فکر پیش کی ہو۔ یہ معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ہیں اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرہ۔۱۲۴) (یعنی اے ابراہیم علیہ السلام! میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں)۔

۵۔ حنیفی مِلّت کی اصلی روح

ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اصل روح یہ تھی کہ کسی بھی جماعت پر کسی شخص کی بادشاہی نہ ہو اور کوئی چیز بھی مخلوقات میں سے خدا نہیں بن سکتی۔ اس عقیدہ کو ہی توحید کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا فکر ہے کہ جس کو ہر ایسا شخص پسند کرے گا جس کی انسانیت اور عقل سلامت ہوں گے کیونکہ کوئی بھی انسان نہیں چاہتا کہ اپنے جیسے انسان سے دھوکا کھاوے اور اس کا زیردست ہو کر رہے۔ بلکہ ہر انسان کسی ایسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں مشورہ لیا جائے اور اس مشاورت میں اس کو بھی دخل ہو۔ یہ گویا کہ انسانی فطرت ہے۔

اس کے علاوہ بڑے حکماء کے یہاں یہ بھی ثابت ہے کہ اس جسمانی دنیا کے پردہ کے پیچھے ایک اور ذات بھی ہے جس کے لازمی صفات کی بنا پر یہ جہان پیدا ہوا ہے۔ وہ ذات انسانی حواس کے سمجھنے سے بالکل دور ہے۔ چنانچہ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو اپنے حواس سے معلوم کر سکے، اس کو اللہ کا درجہ نہ دے۔ کیونکہ اللہ کی ذات حواس کے دائرہ کار سے بالکل باہر ہے۔

پس جو انسان آنکھوں اور دیگر حواس سے معلوم کی ہوئی مخلوق کو اللہ کے مترادف نہیں سمجھتا وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔

٦۔ یہودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملت کی شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کی پوری تبلیغ نہیں کی۔

پانچویں فائدہ میں بیان تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے تھی لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دعوت آپ کی زندگی میں انسانیت کے تمام اقسام تک نہ پہنچ سکی۔ پس آپ نے دعا مانگی کہ کاش: اللہ تعالیٰ اُسے اولاد دے اور ان کے لئے ایک مرکز قائم ہو! اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کی طرف سے آپ کے فکر (یعنی دعوت توحید) کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول کی اور اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام دو فرزند عطا فرمائے۔ ان کے لئے آپ نے دو تبلیغی مرکز قائم کئے۔ اسحٰق علیہ السلام کے لئے بیت المقدس کی مسجد اور اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے مکہ شریف کی مسجد الحرام۔

پھر جو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بلند خیال والا انسان پیدا ہوا ہے اس نے کوشش کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے فکر کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچادے۔ اور خود قوموں کا امام (پیشوا) بنے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان بلند خیال والے انسانوں میں سے ایک بڑے پیغمبر تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کوشش کی لیکن وہ بھی کام کو پورا نہ کر سکے کیونکہ ان کی قوم نے، جسے آپ نے ابراہیمی ملت کی اشاعت کیلئے اپنا مددگار بنایا تھا، اس کی پوری تابعداری نہ کی۔ اس لئے کام ادھورا رہ گیا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی یہ مرضی تھی کہ اپنی قوم کو مصر کے ملک سے نکال کر بیت المقدس میں بسائیں اور وہاں اپنا مقصد پورا کرنے

کے لئے ایک ادارہ قائم کریں لیکن آپ بیت المقدس تک پہنچے ہی نہیں کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا اولعزم دوسرا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کرسکے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا قائم مقام بن کر ابراہیمی دعوت کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچادیں! لیکن یہود نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے فقط ایک "تبلیغی جماعت" تیار کی جو ابراہیمی دعوت کو تمام اقوام تک پہنچاتی رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تیار کردہ تبلیغی جماعت کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی رومی سلطنت نے، جو اسرائیلی قوم سے بالکل الگ قوم تھی عیسائی مذہب قبول کیا اور اس نے وہ کام کر دکھایا جس کی یہود کو توفیق نہ ہوئی۔

یہودیوں نے بھی ابراہیمی طریقہ پر ایک ادارہ قائم کیا لیکن وہ محض اپنی قوم کے لئے تھا دے گر انسانوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ وہ خود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلیں گے اور جو شخص بھی ابراہیم علیہ السلام کے دین کی دوسری اقوام میں تبلیغ کرتا اسے دشمن سمجھتے اور اس کو طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہود کو ابراہیمی ملت کی روح سمجھائی لیکن جب ان سے نااُمید ہو گئے تو اپنے حواریوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ابراہیمی ملت کی روح کو تمام اقوام میں پھیلادیں گے۔

اب ابراہیمی ملت پر چلنے والوں کے دو مذاہب قائم ہو گئے: (۱) یہودی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو بنی اسرائیل کے لئے مخصوص کر دیا (۲) عیسائی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو دیگر اقوام تک بھی پہنچایا لیکن سالہاسال کے بعد انہوں نے نہ صرف یہ کہ ابراہیمی ملت کی روح کو چھوڑ دیا، بلکہ اس کی صورت کو ہی بگاڑ دیا۔

۷۔ حنیفی ملّت کی پوری پوری تبلیغ کون کرے گا؟

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں سے ایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو گا جو ان کی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اس وعدہ پر پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ نبی اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے پیدا ہو گا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے ایسی زمین میں بسایا جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی کیونکہ کھیتی کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ اپنے سرسبز وطن پر فخر رہتا ہے اور وہ اپنے وطن والوں کو منفرد قوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ اس وطن

والے کسی خاص آدمی کی اولاد ہوں گے تو وہ اپنی نسل پر بھی اترائیں گے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھیں گے اور ان میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے سے رُک جائیں گے۔ کھیتی والے ملکوں کے باشندوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے باپ دادا کی اولاد اگر دوسرے ملک میں بستی ہے اور ان کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو وہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کو اپنے وطن کے مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔

اسی طرح اگر ایک جماعت کی بنیاد چند سچے اعتقادات پر قائم ہو اور اس جماعت کا ایک حصہ جدا ہو کر کسی بڑے خوشحال ملک میں آباد ہو جائے تو وہ حصہ اپنے مذہب والوں کی مصلحت کا اس وقت کبھی خیال نہیں کرے گا، جب ان کے مذہب کی مصلحت ان کے وطن کی مصلحت سے مخالف ہو گی۔ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ایک بیابان میں بسانے سے یہی مقصد تھا کہ اس کی اولاد میں وطن کی (فاخرانہ) محبت پیدا نہ ہو بلکہ اپنے مذہب کو ہر حالت میں مقدم رکھتے آئیں۔

آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس بیٹے کا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا جو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو گا۔ وہی ان کی ملت کو تمام دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہو گا۔ اسی لئے اسماعیل علیہ السلام کو حجاز کے بیابان میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سوا بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے کوشش کریں گے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ خوشحال ملکوں کے باشندے ہوں گے۔ پس ان میں کسی نہ کسی قسم کا تمدن آئے گا۔ پھر دوسرے لوگ جن کا تمدن بھی اگرچہ انہی کی طرح ہو گا لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ان کے تابعدار ہو کر رہیں اور وہ ان سے برتر و بلند رہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اپنے ہدف تک پہنچ نہ سکے۔

۸۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے

عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہودی، ابراہیمی ملت کو تمام اقوام میں پھیلانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے تو وہ ان سے نااُمید ہو گئے لیکن پہلی کتابوں سے ان کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مردِ خدا اس کے دین کو تمام اقوام میں عام کرے گا وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہو گا۔ اس لئے انہوں نے ایک پیغمبر کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی اور فرمایا کہ جس کام کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا اس کو وہ آکر پورا کرے گا۔ اور اپنے حواریوں کو بھی وصیت فرمائی کہ جب اس کا ظہور ہو تو تم اس کی تابعداری کرنا۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی مخالفت کے پیش نظر اس بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان نہیں فرمایا بلکہ مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ موقعوں پر حسبِ ذیل طور پر ارشاد فرمایا:

۱۔ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶) یعنی یہ میری قوم تمام اقوام انسانیت میں پھیل جائے۔

۲۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا۔ میں تمہارے پاس آؤں گا۔(یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸) یعنی میری تعلیم توحید کی تکمیل ہو گی۔

۳۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مدد گار (یعنی روح القدس اسے بھیجے گا) وہی تمہیں تمام باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔(یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۵)

۴۔ اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا تو کہاں جاتا ہے، بلکہ اس لئے میں نے یہ باتیں تم سے کہیں کہ تمہارا دل غم سے بھر گیا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مدد گار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم انکی برداشت نہیں رکھ سکتے، لیکن جب وہ (توحید) سچائی کا روح آئے گا تو تم کو پوری سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا کہ کامیابی تمہاری ہے۔
وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ رب کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا رہے گا اور تمہیں خبر دے گا۔ تھوڑی دیر تم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں تم مجھے دیکھ لو گے۔(انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۵)

عیسیٰ علیہ السلام کی ان تمام بشارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تمام بشارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے متعلق ہیں۔ ان بشارتوں کے علاوہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں بہت سی بشارتیں موجود ہیں۔ یہود ان بشارتوں کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے کہ انہوں نے ان پیشگوئیوں کی غلط معنیٰ بیان کر کے بگاڑ دیا ہے تاکہ لوگ ان کے صحیح معنیٰ نہ سمجھ سکیں۔ لیکن وہ اللہ کی صحیح بات کو بدل نہیں سکتے۔ جو شخص بھی توراۃ اور اناجیل کو غور و فکر سے پڑھے گا وہ حق کو سمجھ جائے گا۔ اور جو کچھ ان سرکشوں نے لکھا ہے اسے چھوڑ دے گا۔

۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصلی مقصد

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا یقین تھا اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ کے آنے کی خوش خبری دی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد

متعین ہو جاتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ دنیا میں ایک زبردست حکومت قائم کریں گے جس کا مقابلہ دوسری کوئی بھی حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اس حکومت میں تمام اقوام کو حنیفی ملّت پر جمع کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اس مقصد میں یقیناً کامیاب ہوئے لیکن آپ کے اس مقصد کی تکمیل میں آپ کے خلفاء ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کی کوششوں کو بھی شریک اور شمار کیا جائے۔ ان چاروں بزرگوں نے اس مقصد کو یقیناً پورا کیا۔ ان چاروں کے بعد پھر قدم پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔

۱۰۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا

قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کی خوش خبری ایک مثال کے ذریعے سناتا ہے وہ یہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (سورۂ فتح۔۲۹) اس مثال میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی روح دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے کسی بھی انسان نے نہیں کیا۔ قرآن اس تمام کام کو اکیلے رسول اللہ ﷺ کا کام نہیں ٹھہراتا بلکہ آپ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ اس کام کو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہ کا کام بھی ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی جائز نہیں ہے کہ آپ کی ذاتِ مبارک کو غیبی طاقت کا مالک ماننے اور قانون کا مالک (بادشاہ) ٹھہرائے۔ اور یہ فکر تورات، انجیل اور قرآن سے ثابت ہوتی ہے۔ اس فکر کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔

(پہلی بات) وہ حکماء اور عقلمند جنکی سمجھ پر بھروسہ کیا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی انسانی اجتماع کے لئے قرآن جیسا پروگرام پیش نہیں کیا۔ سورہ اسراء کی آیت ۲۸ کے معنٰی یہ ہیں:

(اے رسول کہہ دو: اگر انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کوئی کتاب آئیں تو اس جیسا نہیں لا سکیں گے اگرچہ بعض ان کے مددگار بھی بن جائیں)

(دوسری بات) صابی مذہب کی جو شاخیں ایران، چین اور ہندوستان میں ہیں ان سب کا مقصد وہی تھا جو رسول اللہ ﷺ اور قرآن نے پیش کیا اور ان مذاہب میں بلند مرتبہ آدمی بھی پیدا ہوئے لیکن انہوں نے بھی تمام انسانی جماعتوں کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے دین جیسا مقصد پیش نہیں کیا۔ جو مذہبی کتابیں ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینیوں اور یونانیوں کے پاس ہیں ان کی اللہ کے فضل سے ہم کو سمجھ ہے لیکن اس (تکمیل توحید کے) مقصد کو کیسے پورا کیا جائے اس میں وہ بھی قرآن سے بہت پیچھے ہیں۔

ان مذاہب کے بعض آدمیوں میں ایسے افکار اور خیالات موجود ہیں لیکن وہ بھی کوئی جماعت نہ بنا سکے۔ جماعت ایک آدمی سے نہیں بنتی بلکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب بہت سارے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں اور اس مقصد پر اتفاق کریں۔

ہندوستان کی تاریخ میں امام ولی اللہ اور آپ کے اتباع سے پہلے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں ملتی جس نے ایسی تحریک پیدا کی ہو جو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اکٹھا کر سکے! شاہ صاحب کا فلسفہ جس طرح مسلمانوں میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اسی طرح ہندوؤں پر بھی۔ اثر کر سکتا ہے۔ کیونکہ امام صاحب کے فلسفہ کی بنیاد ہندوؤں کے فلسفہ کے موافق ہے، اس لئے ہم ولی اللہ کی امامت ہندوؤں سے بھی منوا سکتے ہیں (یعنی ہندوؤں سے بھی اس نام کی حقانیت قبول کرا سکتے) ہندوستان کی قومیں مجتمع ہو گئیں تو پھر پوری دنیا کی اقوام اکٹھی ہو جائیں گی۔

(تیسری بات) رسول اللہ ﷺ اگرچہ عام انسانیت کے رہبر اور انکو پاک کرنے والے تھے لیکن آپ کی پہلی توجہ اور فکر اپنی قومِ قریش کو کمال تک پہنچانے کیلئے تھی کیونکہ:

ا۔ عام عرب بیت اللہ شریف کی عزت کرتے تھے۔ پس بیت اللہ شریف اور ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے وہ قریش کو اپنا دینی سردار سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب اگرچہ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے علم و فضیلت کے قائل بھی تھے اور ان کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بھی سمجھتے تھے لیکن چونکہ ان کا تعلق بیت اللہ شریف سے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ ان کو اپنا دینی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اصل میں عراق عجم سے تھے تو ان کی اولاد اسمٰعیل اور اسرائیل سب عجمی النسل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ سارہ لفظ بمعنٰی حمیدہ خالص سندھی ہے تو سندھ سے تعلق زیادہ قوی ہے۔ قریش اور یہود کے اخلاق سندھ میں اب تک موجود ہیں۔

۲۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد خالص عربوں میں رہ کر عرب بن گئی۔ اس لیے عرب قریش کو اپنا سمجھتے تھے لیکن بنی اسرائیل کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ قریش تجارت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ طبقہ انسانیت کا درمیانہ درجہ ہے اس لئے ان کو جس طرح عوام سے واسطہ پڑتا تھا اسی طرح بادشاہوں سے بھی تعلق تھا۔ وہ بادشاہوں اور انکے حالات کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے کہ وہ ان سے خوش ہو جائیں اور اپنے بیوپار کو ترقی دینے کے لئے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا جانتے تھے۔ یہ بات عام عربوں میں نہ تھی وہ بدو اور اجڈ تھے۔

۴۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے تقریباً ایک سو برس پہلے اکٹھے ہو کر مکہ شریف میں بیت اللہ شریف کے ارد گرد آکر رہنے لگے تھے۔ ان کو رسول اللہ ﷺ کے دادا قصی نے کوشش کر کے اکٹھا کیا تھا۔ اس لئے بھی عام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان سو برس سے پہلے وہ عرب کے مختلف قبائل میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ قبائل قریش کی ایسی عزت کرتے تھے جس طرح آج کل پیروں اور بزرگوں کی اولاد کی ہوتی ہے۔ پس اگر قریش رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و

تبلیغ سے راہِ راست پر آجائیں گے اور عام لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرنا چاہیں گے تو عوام آسانی سے ان کی تابعداری قبول کریں گے!

۵۔ عرب کے شمال میں مختلف یہودی قبائل بستے تھے جو تجارت پیشہ تھے۔ حجاز کے اقتصادی حالات کا دارومدار اکثر انہی پر تھا۔ پس جیسا کہ قریش اور یہودی دونوں تجارت پیشہ تھے اس لئے یہودی ایک تو بیوپار کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں، قریش سے دوستی اور میل ملاپ کی رسمیں جاری رکھتے تھے۔

قریش کی مذکورہ پانچ حالات رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تھیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی شروع عمر میں اپنے مبعوث ہونے سے پہلے قریش کے بڑوں سے سُنا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ایک ایسا رسول پیدا کرے گا جو اس کی ملت کو دنیا میں شائع کرے گا تب آپ نے ابراہیمی ملت کو زندہ کرنے اور قریش کو بلندی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیا کیونکہ یہ کام کرنے کا آپ کی فطرت وطبیعت خواہش کرتی تھی اور اس کام کے صحیح ہونے کی شہادت ایک تو آپ کا دل دیتا تھا دوسری وہ روایت تھی جو ابراہیم علیہ السلام سے نقل ہوتی چلی آرہی تھی۔

نبوت حاصل ہونے کے بعد یہ کام آپ پر آسان ہو گیا کیونکہ وحی کے ذریعہ سے اس کام کے صحیح ہونے کا آپ کو زیادہ یقین ہو گیا۔ نبوت سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ نبوت سے پہلے آپ نہ نبوت کو جانتے تھے اور نہ اس درجہ کے ملنے کی آپ کو اُمید تھی۔ آپ صرف ابراہیمی ملت کے زندہ کرنے سے قریش کو بلند درجہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ کا پروگرام (دستور العمل) یہ تھا کہ آپ قریش اور قریش کے ارد گرد بسنے والے قبائل کی اصلاح میں مصروف ہوں گے پھر جب اس کام سے فارغ ہوں گے اور آپ کی قوم میں آپ کی طاقت بڑھے گی تو دوسری اقوام بنی آدم کی درجہ بدرجہ اصلاح کریں گے تا آں کہ تمام دنیا کی اصلاح کو کمال تک پہنچائیں گے۔

۱۱۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ

امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ کی تعلیم کے موجب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور رسول اللہ اکی ہدایت (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کو پاک کرنے کے لئے بھیجا ہے) کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں میں چار خصلتیں پیدا ہوں۔

۱۔ طہارت: طہارت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت سے کچھ چیزوں کو ناپاک ٹھہراتا اور اپنے بدن کو ان پلید چیزوں سے بچاتا ہے جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔ پھر چونکہ یہ بات اس کے دل میں رکھی گئی ہے اور اسی سے ایک گھڑی بھی غافل نہیں رہ سکتا اس لئے اس خصلت کو کمال تک پہنچانا اس کے لئے آسان ہے پھر وہ ہر کلام، ہر فکر اور ہر عادت، جسے وہ پیشاب اور پاخانہ کی طرح بُرا سمجھے

گا، اس سے بھی اپنے آپ کو بچائے گا! امام شاہ صاحب کے نزدیک یہ خصلت دین کا چوتھا حصہ ہے۔

۲۔ اخبات: تواضع و عجز اختیار کرنا۔ اس خصلت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اپنے باپ دادا یا مرشدوں، استادوں یا نیک بخت حاکموں اور بادشاہوں میں سے کسی کی عزت کرتا ہے تو جب کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہو گا تو اپنے دل میں اس وقت ایک قسم کی عاجزی محسوس کرے گا۔ اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش! وہ اسے کسی کام کے کرنے کا حکم دیں اور یہ اس کام کو خوشی سے پورا کر کے اپنی تابعداری کے ذریعے ان کے نزدیک ہو جائے۔ اس آدمی کو اس بزرگ کے نزدیک ہونے میں ایک قسم کی لذت محسوس ہو گی۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ کوئی آدمی اس کو سکھائے یا نہ سکھائے لیکن یہ بات اس کے دل میں رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ اپنے دل کی ہدایت سے یا کسی نیک بخت کے ہدایت کرنے سے اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خواہش اس درجہ کو پہنچے گی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک نہیں کرے گا۔ تب کہا جائے گا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے کی خصلت حاصل ہو گئی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی کے آگے عاجزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا۔ جس کے آگے عاجزی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں دیکھے گا اس کے آگے عاجزی کبھی نہیں کرے گا۔ اس کا باپ بھی اگر اس کو کوئی حکم دیگا تو اس لئے اس کی تابعداری کرے گا کہ وہ سمجھے گا کہ باپ کی تابعداری کرنے سے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہو جاؤں گا۔

۳۔ سماحت (سخاوت): اس خصلت کی حقیقت یہ ہیکہ انسان بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے، اس کا دل چاہتا ہے کہ اچھا کھانا کھائے۔ اچھے کپڑے پہنے اچھے مکان میں رہے۔ اس کی خوبصورت عورت ہو اور قوم میں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کو قرب حاصل ہو۔ پھر اگر کسی انسان کی طبیعت ایسی ہو جائے کہ اچھا کھانا کھائے اور عورتوں سے صحبت کر کے ان لذتوں کو یاد کرتا ہے تو یہ طبیعت اس کو دوسری ضروریات میں مشغول ہونے اور پورے کرنے سے روکتی رہے گی۔

لیکن اگر اس کی طبیعت ایسی ہو گی کہ کھانا کھانے اور عورتوں کے نزدیک ہونے کے مزہ حاصل کرنے کے بعد جب فارغ ہو تو اس کو بھلا دے اور اس کی طرف کوئی خیال نہ کرے تو یہ انسان اپنے دوسرے کام بھی پورے کر سکے گا۔ اور اپنے اخلاق کو بھی کمال تک پہنچا سکے گا۔ یہ شخص اگر کتاب اٹھا کر پڑھے گا یا مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو وہ اپنے دماغ کو دنیا کے تمام افکار سے پاک کر کے پھر یہ کام کرے گا۔ اس شخص کی طبیعت کی مثال پانی کی طرح ہو گی۔ پانی میں اگر انگلی داخل کرو تو اس میں انگلی

چلی جاتی ہے اور جب باہر نکالو تو پانی میں کسی قسم کا بھی سوراخ دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح یہ انسان جب نفسانی کام کرے گا تو اس کو اچھی طرح سے کرے گا اور جب اس سے فارغ ہو گا تو اسکو بھلادے گا۔ اسی عادت کو ہم سخاوت کہتے ہیں۔

۴۔ عدالت۔ اس خصلت کی انسانی جماعت کو کس قدر ضرورت ہے یہ بات ہر ایک جانتا ہے۔ کوئی بھی اجتماع عدالت کے بغیر قائم نہیں ہوتا۔ پس عدالت یا تو انسانیت کے برابر ہے یا ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں۔ جس انسان، گھر، قبیلہ یا قوم میں انصاف نہ ہو گا اس میں کسی قسم کی بھی انسانیت نہ ہو گی۔

حضرت امام شاہ صاحب ان چار خصلتوں کو تمام احکام کا اصل اور جو ان چار خصلتوں کے مخالف خصلتیں ہیں انہیں ان بُرے کاموں میں شمار کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔

ان چار خصلتوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ شعائر اللہ (یعنی اللہ کو پہچاننے کی نشانیاں) کہتے ہیں۔ حضرت امام ولی اللہ صاحب شعائر اللہ کی عزت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی عزت کے برابر رکھتے ہیں۔ پس جس الٰہی دین کو رسول اللہ ﷺ لائے ہیں اس کا خلاصہ امام شاہ صاحب کے پاس یہ ہے کہ انسان اپنے اندر مذکورہ بالا چار خصلتوں کے مخالف خصلتوں کو چھوڑنے کی کوشش کرے اور شعائر اللہ کی عزت کرے۔

۱۲۔ شعائر اللہ کی حقیقت

شعائر اللہ کی عزت کیسے کی جائے؟ اس کے لئے خدا شناس عارف اور حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے اور اس میں تغیرات کرنے والے کی حقیقت تک انسانوں کی سمجھ پہنچ نہیں سکتی۔ کچھ خاص طریقے ہیں جن سے لوگ اللہ کے وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک طریقہ جسے تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جیسے سورج کی تجلی (عکس) آئینہ پر پڑتی ہے اور سورج آئینہ کے اندر دیکھنے میں آتا ہے پس اگر وہ آئینہ بھی سورج کے عکس جتنا ہو گا (نہ اُس سے بڑا اور نہ چھوٹا) تو لوگ حقیقی سورج میں اور سورج کے اس عکس میں اپنی گزشتہ معلومات ملانے کے بغیر فرق معلوم نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں پر پڑتی ہے اور وہ چیزیں منفرد نظر آتی ہیں پس اگر انسان ان چیزوں کی طرف دیکھنے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف کچھ بھی خیال نہ کرے گا تو سمجھنا چاہئے کہ اس نے اللہ کی تجلی کو دیکھا اور وہ تجلی اس کو اس لئے دکھائی گئی ہے کہ اس کو اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت معلوم ہو جائے۔ انسان کو جب بھی سمجھ میں آجائے کہ یہ اللہ کی تجلی ہے تو اس پر لازم ہو گا کہ وہ اس تجلی کے آگے اپنی

انتہائی طاقت سے جھکے اور اس کی تعظیم کرے۔ اس تجلی کی عزت اللہ تعالیٰ کی عزت کے قائم مقام ہو گی۔ کیونکہ جن چیزوں پر وہ تجلی پڑی انکی طرف کوئی بھی خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو اس تجلی کے دیکھنے کے وقت اس شیشے جیسا سمجھا گیا ہے جس پر صورت کا عکس پڑتا ہے یا ان چیزوں کو عینک کی طرح سمجھا گیا ہے جس سے انسان دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی عرشِ عظیم پر پڑتی ہے۔ اس تجلی کو رحمٰن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ آخری تجلی ہے جس تک انسان کی سمجھ خود کو پہنچانے میں ترقی کر کے پہنچتی ہے اس کے بعد جو تجلی عرش عظیم پر پڑتی ہے اس سے نیچے اس تجلی کی پھر کتنی ہی تجلیاں آسمان اور زمین میں ہیں۔

اگر انسان ان چیزوں کو دیکھتے وقت یہ سمجھے کہ میں اللہ کی تجلی کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف بھی خیال کرے تو اس وقت ان چیزوں کو شعائر اللہ کہا جائے گا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ایمان کے اجزاء میں سے ایک بڑا جزو ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت رکھی ہے جس کی وجہ سے اس کو بلاواسطہ اللہ کے معلوم کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان اپنے تمام مقاصد میں سے اس مقصد کو بڑا مقصد کہتا ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم بلاواسطہ اللہ تک پہنچاتی ہے۔ پس جس کے دل میں شعائر اللہ کی تعظیم ہو گی اس کے دل میں ایمان کے تمام اجزاء میں سے بڑا جزء موجود ہو گا۔

مذکورہ بالا چار خصلتوں کو حاصل کرنے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے انسان ان ملائکہ جیسا ہو جاتا ہے جو اللہ کی تجلی کے آگے حاضر رہتے ہیں۔

امام ولی اللہؒ ان چار خصلتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کو دو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

(۱) التطلع الی الجبروت (یعنی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی طرف دیکھنا جن کا تعلق اس جہان کے نظام سے ہے۔)

۲۔ التشبہ بالملکوت (یعنی ان ملائکہ جیسا ہونا جو اللہ تعالیٰ کی تجلی کے آگے رہتے ہیں۔)

امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک التطلع الی الجبروت اور التشبہ بالملکوت دونوں وصفوں کا اپنے میں پیدا کرنا انسان کا انتہائی کمال ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کی فطرت کے موافق جو مخفی لطائف اور پاک طاقتیں رکھی ہوئی ہیں ان کی وجہ سے یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنا اس غرض سے لازم ہے۔

۱۳۔ عدالت کی وضاحت

یہاں کچھ باتیں جاننا ضروری ہیں اس کے بعد عدالت کی حقیقت اور ضرورت وضاحت سے سمجھ میں آجائیں گی۔

پہلی بات انسان کی حقیقت کیا ہے؟

حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی وہ بڑھنے والا۔ حس رکھنے والا اور ارادہ سے حرکت کرنے اور فکر کرنے والا جسم ہے۔ فکر کرنے کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کو ترتیب دے سکتا ہے، انکے بہت سے اقسام بنا سکتا ہے اور ان کو اپنے فصیح کلام سے دوسروں کے آگے ظاہر بھی کر سکتا ہے۔

انسان کی اس تعریف کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ انسان میں التطلع الی الجبروت اور التشبہ الی الملکوت کی دو طاقتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے انسان کو یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔

۱۔ وہ تمام حیوانات کی طرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا محتاج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں نہ تو انسان کی طاقت کام کر سکتی ہے نہ اس کی عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مثلاً: انسان پانی پیتا ہے پھل کھاتا ہے پانی اور پھل کو اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کسی نے پیدا نہیں کیا۔

۲۔ دوسری بات انسان میں یہ رکھی گئی ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے لیکن اس تک نہ اس کے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں نہ اس کی طبعی طاقت اس کو حاصل کر سکتی ہے پس وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کو اس چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے مثلاً وہ درخت کی چوٹی پر پھل دیکھتا ہے جس تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ پس وہ پھل کو حاصل کرنے کے لئے پتھر مارتا ہے تاکہ پھل ٹوٹ کر نیچے گر پڑے یا درخت کی کسی ٹہنی کے ذریعے اس کو نیچے اُتار لیتا ہے، یہ ہے آلات کا استعمال۔ اس طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں آلات کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ آلات کو حاصل کرنے اور تیار کرنے کے لئے انسان کوشش کرتا رہتا ہے کسی اوزار کے تیار کرنے میں اس کو تھوڑا وقت لگتا ہے اور کسی کی تیاری میں زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے مالدار اس کو سمجھنا چاہئے جس کے پاس اوزار بہت ہوں اور غریب اس کو جس کے پاس اوزار نہ ہوں۔ غریب لوگ مالدار لوگوں کے اس لئے تابع ہوتے ہیں کہ مالداروں کے پاس اوزار ہوتے ہیں اور غریب لوگ اپنی طبعی طاقت سے وہ کام نہیں کر سکتے جو اوزاروں کے ذریعے تھوڑے وقت اور کم طاقت سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے وہ مالداروں کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے ان کی طبعی طاقت ہو اور مالداروں کی طرف سے اوزار، دونوں کو ملا کر کوئی کام کریں اور فائدے میں شریک ہوں۔ پھر اگر مالدار آدمی طاقتور بھی ہے تو وہ ترقی کر کے بادشاہ بن جائے گا۔ اور اگر اس کی طاقت دوسروں کی طاقت کے برابر ہے تو اس کو جماعت کا بڑا بنائیں گے۔

انسان اگرچہ بہت سے حیوانوں سے ضعیف ہے لیکن اس پر اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس کو عقل دی ہے۔ عقل حیوانی طاقت ہے جس پر اس کا ملکی فکر اثر کرتا ہے پس عقل سے انسان اوزار بناتا ہے اور اوزاروں کے واسطہ سے وہ اپنی ضعیف طاقت سے تھوڑے وقت میں وہ کام لے سکتا ہے جن سے بڑے سے بڑے جانور بھی عاجز ہیں۔ اس کی عقل تمام حیوانی طاقتوں کی امام ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوزاروں (آلات) کے استعمال کو اور ان کے واسطہ سے تھوڑی طاقت سے چیزوں کے حاصل کرنے کو ارتفاق کہتے ہیں۔

پھر ارتفاق کی کئی قسمیں ہیں:

۱۔ وہ ارتفاق جس سے کوئی بھی انسان خواہ کہیں ہو، چھوٹ نہیں سکتا۔
۲۔ آداب المعاش (زندگی گذارنے کے طریقے)
۳۔ تدبیر المنزل (گھریلو زندگی کے طریقے)
۴۔ فن المعاملات (لوگوں کے آپس میں معاملات کے طریقے)
۵۔ سیاستہ المدنیہ (شہری نظم ونسق اور زندگی کے طریقے)
۶۔ سیاست (یعنی شہروں کو ملا کر ان کو کس طرح چلایا جائے)

پھر شہروں کو ملا کر چلانے کے کئی اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کو امام ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ سرہٗ خلافت کہتے ہیں۔ جب تک ایسی زبردست خلافت جس کا مخالف جماعتیں مخالفت کرنے کے باوجود مقابلہ نہ کر سکیں اور جب تک وہ قائم نہ ہو جائے کسی آدمی کے لئے بھی سستی کر کے بیٹھ رہنا جائز نہیں۔ یہ بات اُس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ اوزاروں کے استعمال میں درجۂ کمال کو پہنچ جائے۔

۱۴۔ رسول اللہ کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطری صفات کے خلاف نہیں

امام ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ مذکورہ بالا ارتفاقات کو انسانی فطرت سے باہر کی چیز نہیں کہتے جو انسان کے ساتھ چمٹا دی گئی ہو۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت ان تمام ارتفاقات کی خواہش کرتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل یا بیابان میں پیدا ہو اور کسی سے بھی کوئی رسم ورواج نہ سیکھے تب بھی اس کو بھوک پیاس لگے گی، عورت کی خواہش ہو گی اور شادی کرنے کے بعد اس کے بال بچے پیدا ہوں گے جس کے بعد بہت سے گھر بن جائیں گے اور ان میں خرید وفروخت اور ان کے لین دین ہوں گے۔ اس طرح پہلا ارتفاق ترتیب وار موجود ہو جائے گا۔ پھر جب آبادی بڑھے گی۔ تو ضرور ان میں بلند اخلاق آدمی

پیدا ہوں گے اور ان کے سامنے ایسے معاملات پیش آئیں گے جن کی وجہ سے سب ارتفاقات موجود ہو جائیں گے۔ اس لئے کسی قوم میں انصاف کی بادشاہی کا پیدا ہونا اور بہت سی قوموں میں انصاف کی خلافت (یعنی بین الاقوامی حکومت) کا پیدا ہونا انسانی نوع کی خواہش کے مطابق ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ انسان میں (۱) التطلع الی جبروت (۲) التشبہ بالملکوت (۳) ارتفاقات کو کمال تک پہنچانے کی تمام صفات ہیں اور رسول اللہ الوگوں کو تطلع الی الجبروت کا سبق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے، شعائر اللہ کی تعظیم کرنے اور التشبہ بالملکوت کا سبق آپس میں ایسے بلند اخلاق کے پیدا کرنے سے سکھاتے ہیں جن کا فائدہ خاص انہی کو نہیں پہنچتا بلکہ عام انسانی نوع کو پہنچتا ہے اور اس کے بعد ان کی ذات کو بھی پہنچے گا کیونکہ وہ بھی تو انسانی نوع کے افراد میں سے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ ارتفاقات کی تعلیم بھی دیتے ہیں (یعنی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں پیدا کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت اور تھوڑی طاقت خرچ کر کے کیسے حاصل کئے جائیں، اس طرح کہ ملائکہ ان کے کام کو دیکھ کر تعجب کریں) یہ تینوں باتیں تفصیل سے کسی بھی شریعت میں بیان نہیں کی گئیں۔

۱۵۔ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف مرتبے اور اس کے اچھے اعمال کا بیان

ترتیب وار رکھی ہوئی چیزوں میں جب کوئی چیز اثر کرے گی تو اس چیز کا اثر، ترتیب وار تمام چیزوں میں ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق ظاہر ہو گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف رنگدار شیشوں کو ترتیب وار رکھا جائے اور پھر ایک شیشے کے سامنے موم جلائی جائے۔ اس موم کی روشنی تمام شیشوں میں ان کے رنگوں کے موافق ظاہر ہو گی۔ ظاہر میں تمام شیشوں میں جدا جدا روشنی نظر آئے گی لیکن ہر عقلمند ایسا ہی کہے گا کہ جو روشنی پہلے شیشے میں ظاہر ہوئی وہ ہی تمام شیشوں میں نظر آتی ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد انسان کی حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ انسان چار چیزوں سے بنا ہوا ہے: (۱) بدن (۲) ہوائی روح (۳) نفسِ ناطقہ (۴) ملکوتی روح (یعنی الٰہی روح۔ ملکوتی روح اور الٰہی روح ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جس کو النوع یا انسان کبیر یعنی بڑا انسان کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جس طرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں۔ ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آگئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آگئے اور جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں ان کی طاقت کے عکس بھی آگئے۔ اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے اس کا

عکس بھی ان عکسوں میں آگیا۔ ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے۔ باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ دونوں عکس ایک جیسے نظر آئیں گے۔ ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ یہ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہو گا اور ملکی روح اس کی روح ہو گی۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں منی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور ماں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں پھر بچے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالمِ مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفسِ ناطقہ (عینی فکر کرنے والا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اس لطیف ہوا کو نسمہ یا ہوائی روح یا برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت میں باقی حیوانات سے جدا ہوئی ہے وہ نفسِ ناطقہ کے سبب ہوئی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے۔ اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہو گا تو وہ عاجزی ان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلا دیتے ہیں۔ اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہوا اور نورانی روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک جسم عالم مثال سے دلاتا ہے اور وہ جسم لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے کے بعد حفاظت کی جاتی ہے۔ عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالمِ مثال والے جسم سے بھی۔

انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں: (۱) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے

مجموعہ کو انسان کہا جائے گا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی بلکہ فقط اس کا نفسِ ناطقہ پہنچ سکے گا تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفسِ ناطقہ کو کہا جائے گا۔ اسی طرح جب انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا جائے گا۔ اور ملکی روح اور روحِ الٰہی ایک ہی چیز ہے۔ تو یہ ذات پاک وہاں پہنچی جہاں کا خمیر تھا۔ یہ ہے مطلب اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں چنانچہ جو چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہو گی وہ نفس ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہو گی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہو گی وہ ہوائی روح میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہو گی۔ اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہو گی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہو گی۔ پس انسان کے ہر ایک جز میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز ہے۔ پس سمجھنا چاہئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے۔ بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اتری تھی ایسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی روح تک پہنچے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتفاقات سے بہتر ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور سب سے بُرا ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ کرے۔ جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور پچھتاوا کرنا پڑتا ہے۔ جو جہنم کی زندگی ہے۔ اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن اس کو نفسِ ناطقہ اور الٰہی روح قبول نہ کرے جیسے بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے ضرورت بھی ہے لیکن گر ان کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے انہیں کیا جاتا۔ اور جیسے وہ کام جن سے انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفسِ ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الٰہی روح قبول نہ کرے۔ یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں۔

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اسے انتہائی خوشی حاصل ہو گی اور اس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں۔ جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چار اخلاق ہوں گے اور انسان کا نفسِ ناطقہ شعائر اللہ کی عزت کرنے سے اللہ کی طرف دیکھنے والا ہو گا تب اس کی انانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الٰہی روح تک پہنچے گی۔

۱۶۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا خلاصہ:

پندرھویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنے والے ہیں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو ارتفاقاتِ صالحہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے اوزاروں کے ذریعہ تھوڑے وقت میں کم طاقت خرچ کرنے سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہو جائے گی تو آپ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ خود ہیں لیکن اس تعلیم و تہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھا سکیں اور اس کام کو رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا جائے گا۔ یہ معنیٰ ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنیٰ سے رسول اللہ ﷺ، اور ان کے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور ان دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ ﷺ کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنی سے رسول اللہ ﷺ نے ارضِ مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا۔ اور قیصر و کسریٰ کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہو جائیں یا ذمی بن کر اسلامی اجتماع کو خراج تحسین دے کر ان کے حکم کے فرمان بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعائر اللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے قائم کی اور اس کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے پورا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو انسانی نوع کے لئے ایک مقدس مثال بنایا ہے کہ ان کی ہمت سے ایک ایسی خلافت قائم ہو گئی جس کو پانچ سو برس تک آپ کی قوم قریش نے چلایا اور دوسرے پانچ سو برس دوسری اقوام نے چلایا جنہوں نے آپ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا۔ سورہ جمعہ میں آیت ۲ سے ۴ تک اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات سے آخرین کے لفظ سے مطلب فارس، روم، ہندوستان اور ترک ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد جب

کبھی انسانی نوع کا نظام ارتقاقات میں ترقی کرنے سے بدلتا رہے گا تو حکومتوں کی صورت بھی انسانی اجتماع کے موافق ضرور بدلتی رہے گی۔

ہزار سال کے بعد جب لوگوں کا نظام ارتفاقات میں ترقی کرنے سے بدلا تو مسلمانوں کے رہنما اپنے پرانے طریقہ کو بدل نہ سکے۔ اس لئے ان کی شان و شوکت فنا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جب ہمیں امام ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر چلنے سے دین کی سمجھ پیدا ہوئی تب ہم نے سمجھا کہ ہزار سال کے بعد جو مسلمانوں کی شان و شوکت فنا ہوئی اس میں قصور ہمارا ہی تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کے تعلیم میں کوئی قصور نہ تھا۔ (تفسیر المقام المحمود ص ۱۶۱ سے ۱۸۳)

☆

حزب اللہ کی تاسیس مکہ معظمہ میں

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا حزب، مکہ معظمہ میں پیدا ہوا، وہاں وہ بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چند آدمیوں سے زیادہ اس کے ماننے والے نہ تھے بایں ہمہ ایک دنیا ان کے نام سے کانپ رہی تھی۔ چنانچہ اس حزب کو فنا کرنا ہر شخص اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ وہ حضرت ابراہیم کی متابعت میں حنیفی دین کو قائم کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اور کسی مخالف قوت کو نہیں مانتا تھا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ تھی۔ یہ حزب مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے اپنا نظام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے فی الحال طرح دیتا جاتا تھا۔ جس نے مخالفت کی یا ضد، اس سے ہٹ گئے یہ ان کی سیاسی پالیسی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کے نزدیک لڑنا جائز نہ تھا۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ لوگوں نے خواہش کی کہ لڑنے کی اجازت مل جائے۔ مگر قرآن نے اس وقت یہی حکم دیا کہ "كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ" (۷۷:۴) (اپنے ہاتھ روک کر رکھو) اس سے بھی واضح سند یہ ہے کہ سورۃ کافرون مکی سورت ہے اور وہ تمام دنیا کے مخالفین کے لئے الٹی میٹم ہے کہ، "تم سے صلح کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ جو لوگ دین کے اندر، "سیاست کیسے ترقی کرتی ہے" کے سیاسی اصول پر مطالعہ نہیں کرتے بلکہ سب چیزوں کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے حل کرنا چاہتے ہیں وہ محمد رسول ﷺ کی زندگی اور قرآن حکیم کی تعلیم کو منظّم طور پر کبھی بھی سمجھ نہیں سکتے۔

حزب اللہ مدینہ منورہ میں

حزب اللہ جس کی بنیاد مکہ معظمہ میں رکھی گئی تھی اب اپنا مرکز بدل کر مدینہ منورہ میں جمع ہوتا ہے۔ وہ یہاں نسبتاً آزاد ہے۔ یہاں کمزور طاقتوں نے حزب اللہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ سورۃ مجادلہ میں اس طرف توجہ دلائی گئی کہ ان مخالفین کو حقیر نہ سمجھو۔ اگر ان کا سدباب نہ کیا گیا تو یہ اس نئی

سوسائٹی کو کھاجائیں گے۔اس پر مسلمان سنبھلے اور منافقین ڈر گئے۔

منافقین سے مقابلہ

منافقین جس طاقت کے بل بوتے پر باتیں بناتے تھے وہ یہود کی طاقت تھی جن کے قریب پاس ہی تھے۔ ادھر حجاز کی تمام سرمایہ داری یہود کے قبضے میں تھی۔ اور جاہلیت میں قریش بھی تاجر ہونے کی حیثیت میں سرمایہ داری سے کسی قدر اُنس پیدا کر چکے تھے۔ اس لئے یہود اور قریش ہم پیشگی کی وجہ سے آپس میں ملتے رہتے تھے۔ اب ان لوگوں نے ادھر تو مدینہ میں مسلمانوں کے گھروں میں فساد ڈلوانے کے لئے خفیہ سازشیں شروع کردیں اور ادھر کسریٰ اور قیصر تک اپنے پیام پہنچانے شروع کر دیئے۔ اب اس سیاسی پارٹی کا جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتی ہو ایسی حالت میں صبر سے بیٹھے رہنا جائز نہ تھا۔ اگر مخالفین حملہ نہیں کرتے تو یہ سیاسی حزب حملہ کرے گا۔ یہ ہے وہ حملہ جسے لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (الحشر:۲) کہا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ پہلا اقدامی حملہ تھا۔ اس سے پہلے جتنی جنگیں تھیں وہ سب مدافعانہ تھیں ۔ بعض لوگوں نے صرف ان مدافعانہ جنگوں سے قاعدہ بنالیا کہ حزب اللہ کا کام صرف مدافعانہ جنگ کرنا ہے۔ یہ لوگ ان اقدامی جنگوں کو بھی دیکھیں جو پیغمبر ﷺ اور آپ کے خلفاء نے کیں (غزوہ بنی نضیر اس قسم کی اقدامی جنگوں کی پہلی مثال ہے)۔

کیا اسلامی جنگ مدافعانہ ہے؟

مسلمانوں میں قدیم سے ایسی جماعتیں چلی آتی ہیں جو اسلام کا نام تو لیتی ہیں مگر اس کی سیاست نہیں سمجھتیں۔ ایسی جماعتوں کے لوگ اسلام کی تعلیم کو فقط اخلاقیات میں منحصر کر دیتے ہیں اور سیاسی تقدم کو ایسی شرطوں کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں جن کا تحقق ناممکن ہے، اسی طرح وہ قوم کو مار دیتے ہیں۔ اس قسم کی جماعتیں جہاں کہیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انہوں نے فائدے کی بہ نسبت نقصان زیادہ پہنچایا۔

برصغیر میں انگریزی غلبے کے بعد مسلمانوں میں دو تحریکیں چلائی گئیں۔

بعض نے قرآنی حکمت کو سمجھتے ہوئے اس خیال کی تائید کی کہ اسلام کی جنگیں ہمیشہ مدافعانہ رہی ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اسلام نے کبھی حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مدافعت ہی کی ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

قرآن حکیم کی آیت "هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" (التوبہ۔۳۳) سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن حکیم بین الاقوامی انقلاب کا پروگرام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جماعت کی صورت میں انقلابی ذہنیت والے استاد ہر طبقے میں موجود رہے۔ مثلاً حضرت

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن میں "قرآن اور آنحضرت ﷺ کی سیرت کا انقلابی تخیل" پایا گیا۔

اسلام اور جنگ :

الغرض انقلابی جماعت دیکھے گی کہ وہ مخالفوں کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ اقدامی حملہ کرنے میں تاخیر نہیں کرے گی۔ اس مسئلے کو یوں حل کیا گیا کہ حملہ کرنے میں پیش قدمی کرنا یا مدافعت پر اکتفا کرنا یہ دوسرے درجے کی چیز ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا قائد لشکر کا کام ہے۔ یہ اصولی بحث نہیں ہے۔ کمانڈر اپنی فوج کی حالت کے مطابق مدافعت ہی کو کافی سمجھے گا تو فقط مدافعت ہی کرے گا، اور اگر حملہ کرنا ضروری خیال کرے گا تو حملہ کرنے میں پیش قدمی کرے گا۔

دنیا میں مذہبی پروگرام دو طریقوں پر چل رہے ہیں۔ بعض مذاہب وہ ہیں جو لڑنا اور حملہ کرنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں سمجھتے جیسے بدھ دھرم والے جو اصولاً اہنسا کے قائل ہیں اور جنگ کو کسی شکل میں بھی جائز نہیں سمجھتے۔

دوسرے وہ مذاہب ہیں جن کے نزدیک حسب ضرورت لڑنا جائز ہے۔

پس اصولی بات یہ ہے کہ کسی مذہب کے نزدیک جنگ جائز ہے یا نہیں۔ اس معیار کے مطابق قرآن حکیم جنگ کو بالکل جائز رکھتا ہے۔ قرآن حکیم ایک عظیم الشان بین الاقوامی انقلاب کا زبردست حامی ہے۔ قرآن فقط انقلابیوں کی چیز ہے جو مناسب موقع پر اپنے انقلاب کی کامیابی کے لئے لڑنا جائز سمجھتے ہیں۔ (قرآنی شعور انقلاب۔ ص۱۸۶،۱۸۹)

قومی انقلاب کی دعوت

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل۔۱۴)

(ہم نے تم عربوں کی طرف اسی طرح نگرانی کرنے والا رسول بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا)

بین الاقوامی انقلاب کے چند اصول بیان کرنے کے بعد ان کو قومی انقلاب میں استعمال کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ یہ قومی انقلاب آگے چل کر بین الاقوامی انقلاب کی شکل اختیار کرے گا۔ اور قومی انقلاب لانیوالی جماعت ہی اس بین الاقوامی انقلاب کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی Working Committee) بن جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں :

حضرت امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ عرب کے لئے قومی نبی ہیں تا کہ اہل عرب کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور ان میں قانون الٰہی جاری کریں۔ دوسری یہ کہ آپ تمام اقوام عالم کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امامؒ فرماتے ہیں کہ:

وَهٰذَا الْاِمَامُ الَّذِیْ یَجْمَعُ الْاُمَمَ عَلٰی مِلَّةٍ وَّاحِدَةٍ یَّحْتَاجُ اِلٰی اُصُوْلٍ اُخْرٰی غَیْرَ الْاُصُوْلِ الْمَذْكُوْرَةِ فِیْمَا سَبَقَ، مِنْهَا اَنْ یَّدْعُوَ قَوْماً اِلَی السُّنَّةِ الرَّاشِدَةِ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُصْلِحَ شَاْنَهُمْ ثُمَّ یَتَّخِذَهُمْ بِمَنْزِلَةِ جَوَارِحِه فَیُجَاهِدُ اَهْلَ الْاَرْضِ وَیُفَرِّقُهُمْ فِی الْاٰفَاقِ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰی: (كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ) وَذٰلِكَ لِاَنَّ هٰذَا الْاِمَامَ نَفْسَهٗ لَایَتَاَتّٰی مِنْهُ مُجَاهَدَةُ اُمَمٍ غَیْرِ مَحْصُوْرَةٍ وَّاِذَا كَانَ كَذٰلِكَ وَجَبَ اَنْ تَكُوْنَ مَادَّةُ شَرِیْعَتِه هُوَ بِمَنْزِلَةِ الْمَذْهَبِ الطَّبِیْعِیِّ لِاَهْلِ الْاَقَالِیْمِ الصَّالِحَةِ عَرَبِهِمْ وَعَجَمِهِمْ ثُمَّ مَاعِنْدَ قَوْمِه مِنَ الْعِلْمِ وَالْاِرْتِفَاقَاتِ وَیُرَاعٰی فِیْهِ حَالُهُمْ اَكْثَرَ مِنْ غَیْرِهِمْ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۱۸)

”اس بین الاقوامی دعوت دینے والے نبی کی کامیابی کے اصول ان اصولوں سے مختلف ہوں گے جو ایک امام صرف اپنی قوم کے اندر دعوت کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ یہ بین الاقوامی امام اپنی قوم کو صحیح سنت کی دعوت دے گا۔ اور انہیں پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کر کے ان کو اپنا آلہ کار بنائے گا۔ وہ ان کی مدد سے باقی اقوام عالم سے لڑے گا اور ان کو چاروں طرف اپنی دعوت کا پیام دے کر بھیج دے گا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی آیت: كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران۔ ۱۱۰) (تم امت کا بہترین طبقہ ہو جو تمام دنیا کے لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ امام تنہا بنفس نفیس لاتعداد اقوام کے پاس شریعت نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے قانون شریعت کا جوہر تمام اقوام کے لئے خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب جو اچھی آب و ہوا کے خطوں میں بستی ہیں بمنزلہ مذہب طبیعی ہو۔ بایں ہمہ اس امام کی قوم کے علوم و ارتفاقات کا دیگر اقوام کی بہ نسبت اس تعلیم میں زیادہ خیال رکھا گیا ہو۔) پس بین الاقوامی دعوت دینے والا امام اپنا کام بین الاقوامی دعوت سے شروع نہیں کرے گا۔ بلکہ سب سے پہلے اپنی قوم کے صالح عناصر کو جمع کر کے قومی انقلاب برپا کرے گا۔ اور پھر اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ (جیسے عشرہ مبشرہ اس قومی انقلاب کی مجلس عاملہ تھی) دوسری اقوام میں کام کرے گی اور ان کے اندر انقلاب برپا کرے گی۔ (قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۳۴۰)

☆

بین الاقوامی درجہ

آپ کی نبوت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ مِلّتِ حَنِیۡفِیَۃ ابراھیمِیَّہ پر تمام اقوام عالم کو جمع کریں گے۔ کیونکہ انسان کی نوعی ترقی کا یہی راستہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دعاء "الفاتحہ" میں اپنے آپ کو "رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ" کی حیثیت سے شناخت کروایا ہے۔ اس تمہیدی دعا کے بعد سورۂ بقرہ وغیرہ باقی قرآن حکیم میں تمام اقوام عالم کے لئے بنیادی دستور حیات دیا گیا ہے، جس پر انہیں جمع کیا جائے گا۔

سورۃ فاتحہ قرآن حکیم کا مقدمہ ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی عالمی حیثیت کی طرف اشارہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی نبوت کا یہ درجہ ہی آپ ﷺ کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ اور سورۃ العلق کو قرآن حکیم کے آخر میں لے جانا ظاہر کرتا ہے کہ قومی درجہ جس کی طرف سورۃ العلق میں اشارہ ہے، بین الاقوامی عالمی درجے کے لئے بطور تمہید اور وسیلے کے تھا۔ اس لئے انسانیت کے اندر عالمی تحریک ہی قرآن حکیم کی دعوت کا عنوان بن سکتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

اَلۡاَنۡبِیَآءُ قَبۡلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کَانُوۡا یُبۡعَثُوۡنَ اِلٰی اَقۡوَامِھِمۡ خَاصَّۃً.... وَبُعِثَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۴)

(ترجمہ) یعنی نبی اکرم اسے پہلے جو انبیاء گذرے ہیں وہ سب کے سب اپنی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن حضرت محمد رسول اللہ ادنیا کی تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ:

"وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیۡ فِیۡ زَمَنِ اِبۡرَاھِیۡمَ عَلَیۡہِ السَّلَامُ ھُوَ نِسۡیَانُ التَّوۡحِیۡدِ نَزَلَ الۡحَقُّ بِاِزۡآئِہٖ بِاِشَاعَۃِ التَّوۡحِیۡدِ وَتَوۡلِیۡدِ الۡعِبَادَاتِ مِنۡ طَھَارَۃٍ وَصَلٰوۃٍ وَزَکٰوۃٍ وَحَجٍّ وَّصَوۡمٍ وَذِکۡرٍ وَلَمَّا کَانَ الشَّرُّ السَّارِیۡ فِیۡ زَمَنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ ھو اخۡتِلَالُ الۡمِلَلِ وَانۡقِلَابُ الۡاِرۡتِفَاقَاتِ خَاصَّۃً عَلٰی اَصۡحَابِھَا وَکَانَ الۡاَمۡرُ اَشَدَّ وَاَقۡسٰی نَزَلَ الۡحَقُّ بِاِزۡآئِہٖ بِالۡجِھَادِ وَاِشَاعَۃِ الۡعِبَادَاتِ وَتَوۡقِیۡتِھَا وَالۡقَضَآئِ بِزَوَالِ دَوۡلَۃِ الرُّوۡمِ وَالۡعَجَمِ وَانۡتِظَامِ اَمۡرِ النُّبُوَّۃِ کَھَیۡئَۃِ الۡاِرۡتِفَاقِ الرَّابِعِ

(التفہیمات الالھیہ جلد اول ص ۸۳،۸۲)

(ترجمہ: سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نسیان توحید کا معاشرہ انسانی میں پھیل چکا تھا اس لئے حق اس کے بالمقابل نازل ہوا یعنی اشاعت توحید اور طہارت صلوۃ، زکوۃ، روزوں اور ذکر الٰہی کی عبادات جاری کرنے کی شکل میں۔ لیکن چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ا کے زمانے میں اقوام عالم کی ثقافتوں میں خلل پڑ چکا تھا اور انکی ارتفاقی زندگی میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا اور یہ حالت نہایت شدید صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ

خرابیاں اقوام دنیا کے بدن میں دور تک سرایت کر گئی تھیں۔ اس لئے اب حق ان ضرورتوں کے لئے نازل ہوا اور قرار پایا کہ ان خرابیوں کے خلاف جہاد کیا جائے اور عبادات کی اشاعت کی جائے، ان کے ادا کرنے کے اوقات معین کر دیئے جائیں اور قضا و قدر نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ رومی اور ایرانی سلطنتیں برباد کرکے ان کی جگہ نبوی نظام بین الاقوامی پیمانے پر قائم کیا جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے تشریف لاکر انسانی فلاح و خیر کا دروازہ کھولا جو آج تک نہ کھلا تھا اور اس خیر و فلاح انسانی کی تعلیم کے ذریعے سے انسانوں میں سے ایک ایسی امت (جماعت) منظّم کی جو نوع انسانی کے لئے بہترین (نمونے کی) جماعت بن گئی)

حنیفیّت عالمی تحریک ہے:

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ کی تحریک عالمی تحریک (World Movement) ہے صرف عربی تحریک نہیں ہے۔ عربی تحریک اس عالمگیر تحریک کی ترقی کا ایک زینہ تھی اور اس کے ارتقاء کی ایک منزل۔ یہ عالمی تحریک اصل میں حنیفی تحریک ہی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو اس کی فطرت کے مطابق کمال تک پہنچایا جائے۔

دینی اور سیاسی تحریک میں فرق:

حنیفی تحریک میں ذہنی، عقلی، معاشی اور معاشرتی تمام پہلو موجود ہیں اور ان تمام پہلوؤں میں ترقی ہی، اسے تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ ان پہلوؤں کے لحاظ سے یہ تحریک دینی بھی ہے اور سیاسی بھی، لیکن آج کل بعض لوگ دینی حرکت اور سیاسی حرکت میں فرق کرتے ہیں۔ یہ لوگ دینی حرکت کو خیالی (Idealogical) تحریک کہتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ صرف رہبانیت کی تحریک بن کر رہ جاتی ہے۔

سیاسی تحریک کو حقیقت پسندانہ (Realistic) تحریک قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک حنیفی تحریک کے بارے میں "دینی" اور "سیاسی" کی یہ تقسیم صحیح نہیں ہے اور نہ یہ تقسیم کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔

اصل میں انسانیت شروع سے آخر تک ایک وحدانی (Unitar) چیز ہے اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اجتاعیت انسانی، کسی تحریک کو عمل کی سہولت کی غرض سے دینی اور سیاسی اجزاء میں تقسیم بھی کرلے تو اس سے دو تحریکیں نہیں بن جاتیں۔ کیونکہ ان دونوں کا مقصد بہر کیف انسانیت عامہ کی ترقی ہی رہتا ہے۔ جب اہل دین ایسے خیالات اور اعمال کی طرف رجعت اختیار کرلیں جو غیر محققانہ (Unsceintific) ہوں یا اہل سیاست انسانیت کے صرف معاشی پہلو کو لیکر بیٹھ جائیں اور انسان کی مکمل انسانیت کی ترقی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں تو یہ اختلاف صرف اصطلاحی اختلاف رہ جاتا ہے۔ ہم ان

دونوں کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ ایک بادشاہ ممالک فتح کرنے کے درپے ہو جاتا ہے تاکہ ان میں ظلم دور کر کے انصاف وعدل قائم کرے۔ ایک اور شخص سوسائٹی میں صحیح علم پھیلانے میں لگ جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اصل میں صحیح دین وہ ہے جس کے امام سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ وہی کامل اور مکمل انسانیت سے بحث کرتا ہے اور ان کی تحریک عالمی تحریک ہے جو ایک ہی وقت میں دینی بھی ہے اور سیاسی اور معاشی بھی۔ اس تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر ترقی دینے کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔

دین کو سیاست کی ضرورت :

ایک علمی شخص اپنے علم کو انسانیت عامہ کے لئے مفید دیکھتا ہے۔ وہ یہ علم ان لوگوں کو سکھاتا ہے جو اسے سیکھتے ہیں۔ اس فکر پر ان کے جمع ہو جانے سے طبعی طور پر جماعت (Party) بن جاتی ہے جو اس اجتماع سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر وہ شخص چاہے کہ اس کے عمل کو دوسرے لوگ جو اس کے طریقے سے واقف نہیں ہیں یا جو اس فکر کی ترقی میں اپنے ذاتی مفادات (Vested Interestes) کا نقصان تصور کرتے ہیں قوت کے ذریعے سے خراب کر دیں تو کیا صحیح علم کے مالک کے لئے یہ ضروری نہ ہو گا کہ اپنے فکر کی حفاظت کے لئے قوت دفاع (Defence Power) مہیا کرے؟ اور کیا اس طرح اسے سیاست کے میدان میں آنا نہیں پڑے گا؟ اس سے ظاہر ہے کہ صحیح علم کے لئے سیاست (Politics) اور حکومت (State) ضروری اور ناگزیر ہیں۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ انسانیت ناقابل تقسیم وحدت ہے تو اس سے ہماری یہی مراد ہوتی ہے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: وَيَجِبُ بَذْلُ الْجُهْدِ عَلٰى اَهْلِ الْآرَاءِ الْكُلِّيَّةِ فِيْ اِشَاعَةِ الْحَقِّ وَتَنْشِيته وِاِخْمَالِ الْبَاطِلِ وَصَدِّه فَمْ بِمَالَمْ يُمْكِنْ ذٰلِكَ اِلاَّ بِمُخَاصَمَاتٍ اوْ مُقَاتَلاَتٍ فَيُعَدُّ كُلُّ ذٰلِكَ مِنْ اَفْضَلِ اَعْمَالِ الْبِرِّ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۵۰ طبع منیریہ مصر)

"جو لوگ انسانی معاشرے کی کلی اصلاح حال کے رنگ میں سوچتے ہیں ان پر واجب ہوتا ہے کہ اشاعت حق کرنے اور اسے معاشرے میں چلانے کے لئے اور باطل کا زور توڑنے اور اس کا نفاذ روکنے کے لئے پوری پوری (جانی مالی) کوشش کریں لیکن اکثر یہ کوشش صرف ان شکلوں ہی میں ممکن ہو پاتی ہے کہ مخالفین حق کے خلاف نشر و اشاعت کی جائے اور قتال کیا جائے اس صورت میں یہ دونوں اعمال بہترین نیکی کے اعمال شمار ہوتے ہیں۔"

ایسے ہی یہ بھی صحیح ہے کہ جب کوئی جماعت انسانی منافع میں سے کسی ایک حصے کی خدمت کے لئے

اٹھے لیکن وہ اپنے آپ کو جامعہ انسانیہ (Human Society) کا ایک جزو تصور کرے تو اس کے پروگرام کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ غلط ہو گا کہ وہ جماعت اپنی جزوی خدمت کو کلی قرار دے کر دوسری جماعت کے خلاف صف آرا ہو جائے اور یہ تو اور بھی بڑی حماقت ہو گی کہ وہ کلی تحریک کا انکار کر دے یا اس کی طرف التفات نہ کرے۔

الغرض ائمہ ادیان ہی اصل میں جامع انسانیت (Human Society) کے حقیقی امام ہوتے ہیں ۔ جو لوگ انسانی سوسائٹی کے منافع میں سے چند ایک کو لے کر کام کرتے ہیں وہ انبیاء سے کم درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو اہل سیاست اور اہل فلسفہ و حکمت اور جو سائنسدان اپنے آپ کو ان ائمہ دین کے تحت بطور جزوی کارکن لے آئیں وہ طبعی طور پر ان آئمہ سے دوسرے درجے پر شمار ہوں گے۔ جو شخص دین کے معنی سمجھتا ہے اور اجتماعیت کا مفہوم بھی جانتا ہے اور اہل سیاست و فلسفہ میں سے خدام انسانیت کی بھی پہچان رکھتا ہے وہ ائمہ دین کے سوا کسی کو اجتماعیت انسانیہ کا امام تسلیم نہیں کر سکتا۔

عام مؤرخین بین الاقوامی تحریک کی ابتداء سکندر مقدونی (Alexander of Macedonia) سے کرتے ہیں لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ عالمی انسانی تاریخ کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت قرآن حکیم میں آیا ہے کہ (۲:۱۲۴) "میں تجھے نوع انسانی کا امام بناؤں گا"۔ اور ان کی اولاد اس عالمی پیشوائی کے لئے کام کرتی رہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایسے ہی امام ہیں اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی کی تحریک کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

چونکہ قرآن حکیم بین الاقوامی تحریک پیدا کرتا ہے جس کی ابتداء سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی اس لئے اس کی پہلی سورت میں "رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" کا تصور دیا گیا ہے۔

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۶۰،۵۵)

☆

مقام نبوت

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قریش پر حملہ کرنے کے لئے آئے ہی نہیں ۔ بلکہ ان کی کمی پوری کرنے اور تعلیم دینے کے لئے آئے۔ چنانچہ امام ولی اللہ دہلوی "تفہیمات الٰہیہ جلد اول ص ۲۰۳ میں فرماتے ہیں کہ:

"واضح رہے کہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دو خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں ۔

(۱) نبوت عامہ اور (۲) قریش کی سعادت کا سبب بننا۔

آپ کی نبوت میں مفہمیت کی تمام قسمیں آگئی ہیں ۔ اس سے ہر ایک رنگدار اور گوری قوم کو فیض پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب (رحمت الٰہی) کی مصلحت کلی کا تقاضا ہوا۔ کہ ترکوں کی سلطنت عام طور پر پھیل جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توجہ اسلام قبول کرنے کی طرف پھیر دی۔

باقی رہی قریش کی سعادت تو ان کی لمبی حکومت کی وجہ یہی سعادت تھی۔

میرا وجدان گواہی دیتا ہے کہ اگر کسی سیاسی انقلاب کا تقاضا یہ ہوا کہ ہندوستان کے ہندو مستقل عمومی حکومت پیدا کریں ۔ تو یقینا قانون الٰہی کا فیصلہ یہ ہوگا کہ ہندو لے ڈر اسلام قبول کر لیں ۔ جیسے ترکوں نے قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی عمومیت اور آپ کے صاحب ملت ہونے کا یہی طبعی تقاضا ہے۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کے کلام کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں ۔ کبھی تو آپ نبی ہونے کی حیثیت سے کلام فرماتے ہیں کبھی اس حیثیت سے کہ آپ قریش کی سعادت کا ذریعہ ہیں ۔

اسی فکر کو امام ولی اللہ حجتہ اللہ البالغہ (مطبوعہ مصر) جلد اول ص ۱۲۴ اور ص ۱۲۸ میں یوں ظاہر فرماتے ہیں :

> "واضح رہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ ملت حنیفیت اسماعیلیہ میں پڑی ہوئی کجی کو ٹھیک کرنے، اس کی بگڑی ہوئی شکل کو صاف کرنے اور اُس کا نور پھیلانے کے لئے تشریف لائے۔ جب حقیقت یہ ٹھہری تو لازم آیا کہ اس ملت کے اصول تو قائم رکھے جائیں اور اس کے طریقے نہ ہٹائے جائیں ۔ کیونکہ جب نبی اپنی قوم کی طرف مقرر ہو کر آتا ہے تو اس قوم میں کچھ اچھے طور طریقے باقی ہوں تو وہ انہیں نہیں بدلتا۔ کیونکہ ان کو بدلنا بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت نبی اکرم ﷺ نے بھی ملت حنیفیہ اسماعیلیہ کی شریعت پر نظر ڈالی۔ تو جو چیز حضرت اسماعیل رضی اللہ عنہ کے اصل طریقے پر دیکھی اسے باقی رہنے دیا۔ اور جو چیز بدل چکی تھی اور جس میں فساد اور خرابی آچکی تھی اس کو ہٹادیا۔ آپ نے ملت حنیفیہ کے اشاعت کی بے حد کوشش کی کہ یہ قانون تمام قوموں پر غالب آجائے۔ اس سلسلے میں ملت حنیفیہ میں جو تحریفات دیکھیں ان کو مٹادیا اور بڑے زور سے ان کی نفی کی۔ اور جو ارتفاقات صحیح تھے۔ انہیں قائم رکھا۔ اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ان میں جو خراب رسمیں آگئی تھیں۔ ان سے روکا اور جبراً منع کیا اور اس ملت کے اصول پر بین الاقوامی حکومت قائم کی اور جو لوگ اس بارے میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے ان کی مدد سے جنگیں بھی کیں ۔ یہاں تک کہ مخالفین کی مخالفت دھری کی دھری رہ گئی اور خدا کا قانون سب قوموں پر چل کر رہا۔" (ملخصا)

اور خیر کثیر میں فرماتے ہیں کہ:

"حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرح حضرت محمد رسول اللہ بھی پہلی حیثیت میں اپنی قوم کے لئے نبی بن کر آئے۔ جب اس پر ایک زمانہ گزر گیا تو آپ کی قوتیں چودھویں کے چاند کی جگہ سورج بن کر چمکنے لگیں ۔ پھر ایک اور ترقی ہوئی کہ آپ کی شان کو پورا پورا کمال حاصل ہوا جس سے اوپر کوئی کمال نہیں ہے۔ اب آپ کرۂ زمین کے ہر ایک گوشے کے امام بنائے گئے۔"

آپ کی ان دو حیثیتوں کی حکمت حجتہ اللہ البالغہ میں یوں بیان فرماتے ہیں ۔

"جو امام سب قوموں کو اپنی ملت پر جمع کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ پہلے ایک قوم کو صحیح اصول کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں غلط کاریوں سے پاک کرتا ہے ان کی حالت درست کرتا ہے اور پھر انہیں اپنا آلہ کار بنا کر دنیا کی سب قوموں سے جنگ کرتا ہے اور اپنی قوم کے لوگوں کو سب قوموں کے اندر پھیلا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ کسی امام کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اکیلا تمام قوموں سے جنگ کرتا پھرے۔" (جلد اول ص ۱۱۸)

اس اصول نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں کس طرح کام کیا۔ اس کی تشریح آگے چل کر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"مہاجرین اور انصار کی پہلی جماعت، قریش اور ان کے ارد گرد کے قبیلوں کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان عربوں کے ہاتھوں عراق اور شام فتح کرایا۔ کیونکہ ان علاقوں میں عرب عنصر موجود تھا۔ اسے اپنی اپنی قوم کے اندر عربی اسلامی انقلاب کے لئے تیار کیا گیا۔ پھر ان عراقیوں کے ہاتھوں ایران اور شامیوں کے ہاتھوں روم فتح کرائے (کیونکہ انہیں ان علاقوں کے باشندوں سے مناسبت تھی) پھر ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان اور ترکستان اور رومیوں کی مدد سے حبشہ وغیرہ کے علاقے فتح کرائے۔"

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۵۳۷)

☆

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجتماعی حیثیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اجتماعی تحریک ہے۔ اکیلے حضرت محمد رسول اللہ کا کام نہیں ہے۔ (وہ مزمل۔ رفقاء کار جمع کرنے والے ہیں ۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اور ان کے مشورے سے کام

کرتے ہیں ۔ ان کی نبوت کی حیثیت جداگانہ، مستقل حیثیت ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں اور نہ ان کا کوئی مشیر ہے)؟ قرآن حکیم میں حضرت نبی اکرم ﷺ کی اس اجتماعی حیثیت کی طرف جابجا اشارے موجود ہیں ۔ مثلاً

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ (آل عمران. ۱۹۵)

(جن لوگوں کو گھر بار سے ہجرت کرنی پڑی اور جن کو اپنے وطن سے نکالا گے)

ظاہر ہے کہ وہ تنہا حضرت نبی اکرم ﷺ نہیں تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھی سب مراد ہیں ۔

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انفال ۶۴)

"اے نبی! اللہ تجھے اور تیرے مومن ساتھیوں کے لئے کافی ہے"

اس میں بھی نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو ملا کر ایک جماعت ظاہر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ أَنْزَلَ اللهُ سَكِيْنَتَهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(یعنی پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنین سب پر اطمینان قلب نازل فرمایا (توبہ ۲۶)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ جٰهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (توبہ ۔۸۸)

یعنی رسول اور وہ لوگ جو اس کے شریک ایمان ہیں ۔ اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں ۔ جملہ بھلائیاں ان سب کے لئے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں ۔(

یہاں بھی صحابہ کرام کو رسول کا شریک ایمان یا رفیق فکر اور جہاد میں شریک یعنی رفیق عمل ظاہر کر کے کامیابی کے نمونے کے لئے ساری جماعت کو پیش کیا گیا۔

یہی وہ چیز ہے جسے حضرت نبی اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بھی مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ)جس اصول کار پر میں اور میرے ساتھی ہیں) کے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے۔

مشورہ کرنا آنحضرت ﷺ کے لئے ضروری تھا

آپ کی یہ اجتماعی حیثیت ہے جو مشورہ کرنے کے حکم کو قبول کر سکتی ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ان الفاظوں میں آیا ہے؛

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (آل عمران ۱۵۹)

(ان سے معاملات ملی میں مشورہ (ضرور) لیا کرو۔ اور جب پختہ ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو)

امام ابو بکر جصاص الرازی الحنفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت نبی اکرم ﷺ پر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا لازم تھا۔ دینی امور میں

بھی اور ان امور میں بھی جن کے متعلق خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ اور دنیاوی امور میں بھی۔ یہ غلط کہا جاتا ہے کہ یہ مشاورت محض ان کا جی خوش کرنے اور ان کی قدر بڑھانے کے لئے تھی اور اس لئے بھی کہ آپ کی امت اسی طرح کرے۔ کیونکہ جب کسی کو معلوم ہو کہ مجھ سے جس امر کے متعلق مشورہ لیا جا رہا ہے اور جس بارے میں صحیح رائے پوچھی جا رہی ہے اس کے متعلق میں نے ایک مشورہ اپنی پوری کوشش سے پیدا بھی کر لیا۔ یا سوچ بچار کر کے کوئی صحیح رائے قائم کر لی تو بھی اس پر عمل نہ کیا جائے گا اور نہ اسے قبول کیا جائے گا۔ تو بھلا اس مشاورت سے اس کا جی کیا خوش ہو سکتا ہے اور اس کی قدر کیا بڑھ سکتی ہے؟ بلکہ اس کا اثر الٹا یہ ہو گا کہ ایسے مشورہ لینے والے سے وحشت بڑھے گی۔ کیونکہ اسے علم ہو گا کہ میری رائے نہ کسی کو سننی ہے اور نہ اس پر عمل کرنا ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے لئے ضروری تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں سے ان معاملات میں مشورہ کرتے جن میں کوئی صریح حکم موجود نہ تھا۔ البتہ صریح احکام کے بارے میں مشورہ ناجائز تھا۔ مثلاً یہ پوچھنا کہ نماز ظہر یا عصر کے بارے میں یا زکوٰۃ یا روزے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ بالکل غیر ضروری تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورے کا حکم دیتے وقت یہ نہیں کہا کہ فلاں بات میں مشورہ کرو۔ اور فلاں میں نہ کرو۔ اس لئے لازم تھا کہ ہر دو معاملات میں صحابہ کرام سے مشورہ لیتے"۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"عزیمت (پختہ ارادہ) کا ذکر مشاورت کے بعد آیا ہے[1]۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں وہ عزیمت مراد ہے جو مشاورت سے پیدا ہو۔"

(احکام القرآن جلد دوم ص ۴۱ طبع بیروت)

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت کے مطابق آپ سے دریافت کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ مُشَاوَرَتُ اَهْلِ الرَّأْيِ ثُمَّ اِتِّبَاعُهُمْ یعنی جو لوگ مشورہ دینے کے قابل ہوں، ان سے رائے لے کر ان کی رائے کی پیروی کرنے کا نام عزم ہے۔

---

[1] قرآنی الفاظ کی ترتیب یوں ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ ظاہر ہے کہ اس میں وَشَاوِرْهُمْ (ان سے مشورہ لیا کر) پہلے واقع ہوا ہے اور (فَاِذَا عَزَمْتَ جب تو پختہ ارادہ کرے) بعد میں آیا ہے۔ (مرتب)

مشاورت کی اہمیت :

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے عام طور پر حضرت نبی اکرم ﷺ کے اس بلند اجتماعی تصور کو آپ کی انفرادیت میں گم کر دیا۔

مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن اسلامی حکومتوں کو مشورے سے خالی کر کے مطلق العنان، جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر ننگی تلوار ہے۔ وہ حاکم کیوں قانون الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے؟ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شوریٰ کو مستحب کا درجہ ❷ بنا کر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والے لوگوں نے اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

صحابی سے کون مراد ہیں؟:

ایسے ہی صحابی کی وہ تعریف عوام میں مشہور ہو گئی ہے جس سے بہت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ صحابی کی یہ تعریف کہ اس نے ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو۔ حدیث کی روایتیں جمع کرنے کی خاطر بنائی گئی ہیں ورنہ اصل میں سیرت نبوی کے اعتبار سے صحابی وہ ہے جس نے آپ کی معیت لازم پکڑی اور آپ کے ساتھ آخر تک انقلاب میں شریک رہا۔ تکلیفیں اٹھائیں اور اس تحریک کی صداقت کے متعلق پورے یقین کے ساتھ یہ اطمینان کر لیا کہ انسانیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ❶ یہی وجہ وہ لوگ ہیں جن کی تعریف قرآن حکیم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

---

❷ مستحب وہ امر ہے کہ اس پر عمل کریں تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج بھی نہیں (مرتب)

❶ چنانچہ محدث مازری شرح برہان میں رقمطراز ہیں کہ: لسنا نعنی بقولنا "الصحابہ عدُول" کل من راٰہ صلعم یوماما، اوزارہ لماما، اواجتمع بہ الغرض وانصرف مکثا انما نعنی بہ الذین لازموہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولائک ھم المفلحون) منقول از اسوہ صحابہ از مولانا محمد سعید انصاری جلد اول ص ۱۱ بحوالہ "فتح المغیث" ص ۳۷۷) یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ الصحابۃ عدول (صحابی سب عادل ہیں) تو اس سے ہماری مراد ہر وہ شخص نہیں جس نے آنحضرت ﷺ کو کسی روز دیکھ لیا یا کبھی زیارت کر گیا۔ یا کسی کام سے آیا اور فوراً واپس لوٹ گیا۔ بلکہ ہماری مراد ان بزرگوں سے ہے جنہوں نے آپ کی معیت لازم پکڑی، جہاد میں آپ کی مدد کی۔ آپ کی حمایت میں آپ کے دشمنوں سے لڑے۔ اور اس نور کی پیروی کی جو آپ پر نازل ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں کامیاب ہوئے۔ (مرتب)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (انفال۔ ۷۴)

(یعنی جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے اپنے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جن لوگوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ہے)

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی جنہوں نے آپ کی سیرت (حالات زندگی) کے بنانے میں حصہ لیا چند صفتیں ہیں۔

(۱) اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح۔۲۹) (کافروں پر سخت)

نبی ﷺ کے ساتھی اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہیں: ان کی سختی کے دو پہلو ہیں: یہ لوگ مخالفوں سے لڑنے میں بڑے سخت ہیں۔ کہ موت قبول کر کے لڑنے کے لئے جاتے ہیں۔

(۲) جو لوگ اس تحریک کے کھلم کھلا دشمن (کافر) ہیں۔ یہ لوگ ان کافروں کو انتہائی سزا دینے کے طرفدار ہیں۔ قتل کی ضرورت ہو تو قتل کر دئے جائیں۔ [2] ورنہ جو اس سے کم سزا ضروری ہو وہ دی جائے۔

قتل ہمیشہ اسی وقت کیا جائے گا جب انہوں نے قتل کیا ہو یا وہ لڑنے کے لیے تیار ہوئے ہوں۔ ورنہ ان کی انتہائی سزا یہ ہے کہ ان کی سیاسی تحریک روک دی جائے اور انہیں سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ ان کی عقلمندی سے جو ارتقاقی اور تمدنی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے جماعت کو محروم کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۲) رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحمدل)

وہ "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" بھی ہیں: جو لوگ اس تحریک کی تائید میں ان کے ساتھی ہیں ان کے لئے ان کے پاس سوائے رحمت کے اور کچھ نہیں۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد پر رحمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رحمت سے پیش آتے ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے بھی رحمت کے دروازے کھولتے ہیں جس شخص کے متعلق امکان نظر آتا ہے کہ وہ اس تحریک کی تائید کرے گا۔ اسے مخالف بننے کا موقعہ نہیں دیتے۔

ان کے جو ساتھی مظلوم اور ضعیف ہیں۔ اگرچہ یہ انہیں پہنچانتے بھی نہیں۔ مگر ان پر رحم کرنے کے لئے اپنی تمام عزت قربان کر دیتے ہیں۔ جیسے انہوں نے حدیبیہ کی صلح میں کیا۔ یا حضرت فاروق اعظم نے عراق کی زمین فوجیوں میں تقسیم کرنے سے اس بناء پر انکار کر دیا تھا کہ ان اراضی کا فائدہ بعد میں آنے

---

[2] جنگ بدر میں جو کافر قیدی گرفتار ہو کر آئے حضرت عمرؓ نے ان کے متعلق تجویز کیا کہ ہر ایک مسلمان ان میں سے اپنے اپنے عزیزوں کو قتل کر دے۔ (مرتب)

والی نسلوں کو ملنا چاہئے۔ (ازالۃ الخفاء: امام ولی اللہ دہلوی مقصد دوم ص ۱۲۷)

(قرآنی شعور انقلاب۔ ص ۵۸۰)

☆

رسول اللہ ﷺ کی پارٹی کی ضرورت

اگر کتاب الٰہی کی اشاعت کو پارٹی پروگرام میں منضبط کر لیا جائے، جیسے ہم سورہ مجادلہ میں حزب اللہ کی تاسیس سے استنباط کرتے ہیں اور انسانی عقلمند جماعتوں کا فیصلہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ کوئی انقلاب پارٹی کی آمریت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا تو انبیاء کرام کی کامیابی کو ان کی پارٹی کی کامیابی تسلیم کرنا پڑے گا۔ انبیاء کرام اپنی پارٹیوں کے لیڈر ہوتے ہیں اس لئے دنیا غلطی سے رہنما کو ڈکٹیٹر سمجھ لیتی ہے۔ حقیقت میں کوئی نبی اپنے انقلابی رفقاء کی کامیابی کے بغیر کامیاب نہیں ہوا۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی اپنے رفقاء کی کمزوری کے سبب اپنی تعلیمات کے نتائج نہ دیکھ سکے جیسے موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ بذات خود بڑے اولوالعزم نبی تھے اور ان کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، مگر ان کے رفقاء کی کمزوری سے انہیں بے حد تکالیف پیش آئیں اور منازل مقصود پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت نمبر ۲۶ ملاحظہ ہو۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ

ترجمہ: اللہ نے فرمایا تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس حرام کی گئی ہے وہ اس ملک میں سرگرداں پھریں گے۔ سو تو نافرمان قوم پر افسوس نہ کر!

یعنی کہ اگر یہ (بنی اسرائیل) ایسے ہی ڈرپوک اور بے حس ہو گئے ہیں تو ان کو ارض مقدس کی بادشاہی دینے سے کیا نفع ہو گا؟ لہٰذا سزا کے طور پر یہ چالیس سال یہاں جنگل میں پھریں تاکہ بے غیرت اور بے حس بڈھے مر جائیں اور ایک نئی نسل غیور اور حریت پسند پیدا ہو، وہ جا کر اپنے آبائی ملک پر قبضہ جمالے۔

ادھر قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کی کامیابی کو 'الذین معہ' کی کامیابی پر منحصر کرتا ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

(۹: ۸۸۔۸۹)

ترجمہ: لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان والے ہیں وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں اور انہی لوگوں کے لئے بھلائیاں ہیں اور وہی نجات پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغ تیار کئے

ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ (سورہ الفتح: ۲۹)

ترجمہ: محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں۔ تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع و سجود کر رہے ہیں۔ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی شناخت ان کے چہروں میں سجدے کا نشان ہے۔ یہی وصف ان کا تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف ہے۔ مثل اس کھیتی کے، جس نے اپنا انکھوا نکالا پھر اسے قوی کر دیا۔ پھر موٹا ہو گیا۔ پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ کسانوں کو خوش کرنے لگا۔ تاکہ اللہ ان کی وجہ سے کفار کو غصہ دلائے۔ اللہ نے ان میں سے ایمانداروں اور نیک کام کرنے والوں کے لئے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟:

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کی کامیابی ان کے حزب کی کامیابی ہی ہوتی ہے اس کے بعد اگر یہ پوچھا جائے کہ رسول ﷺ کے ذوی القربیٰ کون ہیں؟ تو بلا تامل یہی جواب دیا جائے گا کہ "اس ﷺ کی پارٹی کے ممبر" مگر ایک ایسا آدمی جس نے انبیاء کی کامیابی کا ایسے نقطہ نگاہ سے مطالعہ نہیں کیا۔ کہے گا "رسول اللہ کے شخصی رشتہ دا!"

رسول اللہ ﷺ کے نسبی قربیٰ

نبی اکرم کے نسبی رشتہ دار اولاد بنی ہاشم اور پھر اولاد علی رضی اللہ عنہ اور اولاد عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی سیاست کا مخصوص انداز یہی تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے طریق پر خلافت قائم کر کے اس کے مرکز میں آنا چاہتے تھے، مگر نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس استحقاق کی ہرگز صراحت نہیں فرمائی۔ بنی امیہ کی خلافت کے زمانہ میں بنی ہاشم حزب مخالف کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اب انہوں نے جماعت کے ذریعے سے کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ کامیابی کے بعد دو حصے ہو گئے (۱) بنی عباس (۲) علویین

نسبی قربیٰ کسی ترجیحی حق کے مستحق نہیں:

بنی عباس نے مرکزی خلافت پر قبضہ کر لیا اور علویوں نے اطراف مملکت پر، علوی، آیت:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ۔۲۳)

ترجمہ: کہہ دو میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز رشتہ داری کی محبت کے)۔... میں 'ذوی القربیٰ' سے اپنی ذات مراد لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اجر یہ ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاندان کی حکومت قیامت تک تمام مسلمانوں کے گلے میں پڑی رہے خواہ وہ حکومت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ کی محنت کا اجر یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے اقرباء سے محبت سے پیش آنے لگیں۔

(نساء۔۱) میں دیکھیے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا

ترجمہ: اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے واسطہ سے آپس میں سوال کرتے ہو اور قرابت والوں کے بارے میں سے خبردار رہو! بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

شریعت اسلامیہ کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ دعوۃ الی اللہ ہے، اللہ کے احکام کا اتباع ہے اور ان کا انصاف کے ساتھ قیام ہے۔ شریعت الہیہ کا دوسرا اجزو اعظم جو اس سے متفرع ہوتا ہے صلہ رحمی ہے یعنی اہل حق کے حقوق بے کم وکاست ادا کئے جائیں۔ انسانی فطرت اسی پر مجبور ہے اور قرآن حکیم اس فطرت انسانی ہی کے تقاضے پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ فطرت خراب ہو جائے تو انسانیت خراب ہو جاتی ہے۔ پس نبی اکرم ﷺ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ میری رسالت کا اجر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم آپس میں صلہ رحمی کرو اور اس باب میں گمراہی میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ واضح موجود نہیں ہے کہ مودۃ فی القربیٰ سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کے ساتھ مودۃ ہے۔

مودۃ فی القربیٰ کا اصل مفہوم

اس دعوت کی کہ لوگ اپنے اپنے اقربا کے حقوق ادا کریں یہ حکمت تھی کہ لوگ اس پر مطمئن تھے کہ نبی اکرم ﷺ ہمیں اس چیز کی طرف بلاتے ہیں جس میں ہمارا ہی نفع ہے۔ پس اہل بیت اور سب مائیں اس دعوت کو سنتی تھیں کیونکہ قطع رحم سے سب سے زیادہ نقصان امہات ہی کو پہنچ سکتا ہے۔ جب انہوں نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ اپنی تبلیغ و سعی اصلاح کا اس کے سوا اور کوئی اجر طلب نہیں کرتے کہ ہماری اولاد ہماری خدمت کرے تو وہ اسلام کی طرف زیادہ مائل ہو جاتی تھیں۔ جو شخص مکہ معظمہ میں اسلام کے پھیلنے کی رفتار کا مطالعہ کرے وہ اس چیز کو نہایت بیّن پائے گا۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبا۔۴۷)

ترجمہ: کہہ دیجئے میں نے تم سے جو کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تم ہی رکھو

پس نبی اکرم ﷺ بھی دوسرے انبیاء کی طرح امت سے کوئی مادی یا غیر مادی اجر طلب نہیں کرتے۔ وہ تو ساری عمر یہی فرماتے جاتے ہیں کہ

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۳۴:۴۷) ۱۰:۷۲، ۲۹:۱۱، ۵۱:۱۱، ۱۰۹:۲۶، ۴۷:۳۴،

اور یہی سنت انبیاء ہے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ متقدم فی الاسلام ہونے کی وجہ سے بنو ہاشم عجمیوں سے افضل واولیٰ ہیں، بشرطیکہ ان میں شرائط خلافت پائی جائیں۔

الغرض قرآن حکیم رسول اللہ ﷺ کے نسبی رشتہ داروں کا اس آیت میں کوئی ذکر نہیں کرتا۔ اس لئے ان سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جو حضور ﷺ کی تحریک میں جان و مال لٹا کر شریک ہوتے ہیں۔ وہ حزب اللہ کے مندرجہ ذیل تین اجزاء ہیں۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے تین قسم کے ذوی القربیٰ:

(۱) مہاجرین۔ آیت نمبر ۸ (۲) انصار آیت نمبر ۹ (۳) تابعین باحسان آیت نمبر ۱۰۔ یہ تینوں قسم کے لوگ ذوی القربیٰ کی تفسیر ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی صحیح پوزیشن

فے میں سے جو حصہ ۵ا رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے وہ کافی بڑی مقدار ہے۔ یہ اس لئے دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی یعنی نسبی رشتہ دار بہت سے ہیں جن کے رسول اللہ ﷺ پر طبعی حقوق ہیں۔ ان کے مصارف اس حصے میں سے نکلیں گے۔ ذی القربیٰ کا جو ۵ا حصہ ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے ذاتی اور نسبتی رشتہ داروں کے لئے نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ تو یہ ہے کہ وہ اپنا ذاتی پانچواں حصہ بھی کبھی پورا وصول نہیں کرتے بلکہ ازواج مطہرات اور قریبی رشتہ داروں کے واجبی حقوق ادا کرنے کے بعد باقی ماندہ رقم پھر یتامی اور مساکین کے حصے میں لوٹا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ خیال بنانا کہ رسول اللہ ﷺ ۵ا حصہ اپنے ذاتی نام سے اور ۵ا حصہ اپنے ذوی القربیٰ کے نام سے لیتے ہیں یہ اس پرانی سرمایہ دارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے لئے شہنشاہیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بنی ہاشم میں چند آدمی اس خیال کے ضرور پیدا ہو گئے تھے مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا نسلی حق جس کے بعض بنی ہاشم مدعی تھے قائم نہ ہو سکا۔ یہ اسلامی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا شرف ہے۔ اس لئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت بڑی عزت کے مستحق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ بعض بنی ہاشم کی پالیسی چل جاتی تو ساری دنیا یہی کہتی کہ رسول اللہ ﷺ نے رسالت کا دعویٰ کر کے اپنے خاندان

کے لئے چند روزہ شہنشاہی پیدا کرلی۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۲۰۲،۱۹۷)

☆

نبی اکرم ﷺ کی جماعت کی خوبی

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ (الفتح۔۲۹) محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی) سے جو جماعت پیدا ہوئی ہے اس کی زندگی ارتفاق اور اقتراب دونوں کے لحاظ سے نمونے کی زندگی ہے۔ انہوں نے بین الاقوامی حکومت بھی پیدا کی اور قرب الٰہی کے بھی اونچے سے اونچے درجوں تک پہنچے۔ ان کا یہ کارنامہ قیامت تک کے انقلابیوں کے لئے اعلیٰ درجے کا نمونہ ثابت ہوگا۔ بیچ میں اس نمونے پر اور نمونے ڈھلتے رہیں گے۔ لیکن اصل نمونہ یہی ہوگا۔ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ نمونے کے اس اولین دور کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم مانتے ہیں۔

اوراس دور کی تاریخ کے جس اعلیٰ پائے کے وہ شرح کرنے والے ہیں اس سے بہتر کوئی دوسرا عالم نہیں مل سکتا۔

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ قرآن کا قانون بین الاقوامی درجے پر غالب رہنا چاہئے۔ یہ جماعت اپنے فیصلے سے اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ یبتغون (چاہتے ہیں) سے یہی مراد ہے کہ اپنی مرضی اور فیصلے سے "چاہتے ہیں"۔

(ہ) سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح۔۲۹)

(ان کی نشانی ان کے مونہوں پر ہے سجدے کے اثر سے)

سجدے کی روح۔۔۔۔۔ قربانی۔۔۔۔۔ ان کے اندر داخل ہوچکی ہے اور اس سے وہ اس قدر نڈر ہوچکے ہیں کہ ان کے چہرے سے ایک نور ابلتا ہے وہ ہر ایک مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انہیں راہ حق سے کوئی مصیبت ہٹا نہیں سکتی۔

(و) ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ (الفتح۔۲۹)

ان کی یہ تمثیل تورات میں (پہلے ہی) بیان کر دی گئی ہے

تورات اور انجیل میں اس جماعت کا ذکر:

تورات میں اس کا اشارہ مجمل ہے۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ میں بنی اسماعیل کو اتنا ہی بڑھاؤں گا جتنا بنی اسحاق کو۔ میں انہیں ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

(ز) وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ

(اور انجیل میں ان کی تمثیل جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا، پھر اس کی کمر مضبوط کی۔ پھر وہ موٹا ہوا پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر۔ خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو) (الفتح۔۲۹)

اس سلسلے میں انجیل کے مندرجہ ذیل مقامات لائق توجہ ہیں:

انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳۔۹ میں ہے کہ:

"سنو، دیکھو، ایک بونے والا بیج بونے نکلا اور بوتے وقت ایسا ہوا کہ کچھ راہ کے کنارے گرا اور پرندوں نے آکر اسے چگ لیا۔ اور کچھ پتھریلی زمین پر گرا جہاں اسے بہت مٹی نہ ملی، اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب جلد اگ آیا۔ اور جب سورج نکلا تو جل گیا اور جڑ نہ ہونے کے سبب سوکھ گیا۔ اور کچھ جھاڑیوں میں گرا۔ اور جھاڑیوں نے بڑھ کر اسے دبالیا۔ اور وہ پھل نہ لایا۔ اور کچھ اچھی زمین پر گرا۔ وہ اگا اور بڑھکر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا"۔

پھل لانے کی مزید کیفیت آگے چل کر آیات ۲۶۔۲۷۔۲۸ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے، اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے، اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے پہلے پتی، پھر بالیں، بعد اس کے بالوں میں تیار دانے"

(ح) لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۔(تاکہ ان سے کافروں کا جی جلائے)

خدا نے قوموں کو رسولوں کے ذریعے سے اپنی کتابیں اور ہدایتیں دیں۔ وہ لوگ اس دین کی عزت کرتے اور اپنی کتاب پر عمل کرتے تو ان کی عزت قائم رہتی اور ان پر کوئی دوسرا حاکم نہ ہو سکتا مگر انہوں نے ان کتابوں کی عزت نہ کی اور اپنے دین کا احترام قائم نہ رکھا۔ بلکہ اس کی عملاً مخالفت کی یہ کفار ہیں۔

اب ایک دیندار جماعت پیدا ہوتی ہے جو ان پر غالب آجاتی ہے۔ کفار اپنے آپ کو بھی دیندار سمجھتے ہیں۔ انہیں غصہ آتا ہے کہ یہ لوگ ہمارے دین پر غالب کیوں آگئے؟ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ یہ باعمل جماعت جو مرنے پر آمادہ ہے۔ ان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والوں یا نیم دلی سے اپنے دین کے ماننے والوں پر غالب آجائے۔

ان نام نہاد "دیندار" قوموں کو مغلوب کرنا ایک دن کا کام نہیں ہے۔ یہ انقلاب قیامت تک جاری رہے گا۔ کیا مہاجرین کی پہلی جماعت کے ذریعے ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح ہو سکتے تھے؟ پس قرآنی تحریک کی ترقی ایسی ہے جیسے کھیتی کا نشوونما پانا۔ یہ چھو منتر کا کام نہیں ہے۔ ارتقائی کام ہے۔ یہ طبعی چیز ہے ہو کر رہے گی۔ مگر بعض لوگ جن کی نظر قرآن پر گہری نہیں ہے طبعی رفتار کو دین سے الگ کرتے ہیں لیکن ہم امام ولی اللہ کے واسطے سے نیچر اور دین کو ایک ہی چیز مانتے ہیں۔ یہ تحریک اس کی مثال ہے یعنی

جس طرح بیج بونے کے بعد کھیتی طبعی رفتار سے ترقی کرتی ہے۔ ایسے ہی یہ قرآنی تحریک طبعی طور پر ترقی کرے گی۔ اور تمام دنیا پر چھا جائے گی۔

یہاں تک حضرت نبی اکرم ﷺ کی جماعت کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ان کی کامیابی کے کفیل بنے۔ اب ایک کلیے کے طور پر جامع اصول بیان کیا جاتا ہے۔

(ط) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں معافی ملے گی اور بڑا اجر ملے گا)

یہ نمونے کی جماعت ہے: اس انٹرنیشنل تحریک کو چلانے والی جتنی جماعتیں ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ ان سب سے وعدہ ہے کہ ان کی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی۔ بشرطیکہ وہ اس پروگرام پر چلتی رہیں۔ وہ اس تحریک سے بڑے بڑے فائدے حاصل کریں گے۔ اِس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔

رسول اللہ کی جماعتی کامیابی جو نمونے کے طور پر قرآن کی عملی زندگی پیش کرتی ہے۔ وہ سورہ فتح کی آخری آیت میں ضبط کر دی گئی ہے اس نمونے پر قیامت تک عمل کرنا ہو گا۔ اب قرآن شریف کو کسی اور نمونے کی ضرورت نہیں ہو گی اور نہ انسانیت کو کسی اور کتاب الٰہی کی حاجت ہو گی۔ تمام مسلمانوں پر ایسی جماعت کا قائم رکھنا فرض ہے۔ (قرآنی شعور انقلاب ص ۵۹۱،۵۸۸)

نبی اکرم ﷺ بطور معلم اور نذیر

رسول اکرم ﷺ کی یہ دو حیثیتیں اس طرح ہیں ۔

(۱) معلم (۲) جماعت کا لیڈر

معلم کی حیثیت سے آپ شاگردوں کے متعلق شہادت دیتے ہیں کہ فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا ہے۔ اور فلاں شاگرد فلاں قابلیت کا۔ یہاں آپ کی شان معلمی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ شاگرد آپ کے ساتھ ایک جماعت کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ۔ آپ اس جماعت کے رہنما ہیں ۔ یہ جماعت منافقوں اور مشرکوں سے بالکل الگ اور خاص صفتوں کی مالک ہے۔ یہ جماعت قرآن کے اس پروگرام پر چلتی ہے کہ مظلوم انسانیت کی خدمت کرو۔ ظالموں کو گراؤ اور مظلوموں کی داد رسی کرو۔ اور اس سارے کام کا بدلہ صرف اللہ سے مانگو۔ اس پروگرام پر جو ٹھیک ٹھیک طور پر کام کرتا ہے اسے حضرت نبی اکرم ﷺ کامیاب زندگی کی بشارت دیتے ہیں۔ (مبشراً) اور اسے یقین دلاتے ہیں کہ اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے فوائد محفوظ ہیں۔ جو لوگ اس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتے انہیں خبردار کرتے ہیں کہ جن کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی ناکام رہے گی۔ وہ بہانے بنا کر دل کو خوش کر لیں ، لیکن کامیابی نصیب نہ ہو گی۔ (نذیرا)

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ ؕ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا (الفتح۔۹)

"تم ضرور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اس کی مدد کرو۔ اور اس کا وقار قائم کرو۔ اور صبح وشام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔"

خدا کی محبت کی معنی

حضرت نبی اکرم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا کی محبت ہے انہیں ایک استاد کی ضرورت ہے جو انہیں بتائے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے اور خدا کی محبت کے دعوے سے انسانوں کی خدمت کس طرح ہونی چاہیے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۵۴۶)

☆

سیدھی راہ

رسول اللہ کی کامیابی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ قریش آپ کی تعلیم کے خادم بنیں۔ اور آپ کے اصول پر جو حکومت پیدا ہو اسے چلائیں۔ تاکہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہم السلام کی دعا عمل میں آئے۔ [1]

اگر یہ صورت پیدا نہ ہو اور آپ دوسری قوموں کی مدد سے اپنا پروگرام کامیاب بنا کر دکھادیں۔ تو گو آپ انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کرنے والے گنے جائیں گے۔ لیکن ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام

---

[1] ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ (البقرہ۱۲۷۔۱۲۹) (اے ہمارے رب! (اسے) قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا تابع بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے حکموں کے نیچے رہ کر زندگی بسر کرے۔ اور ہمیں مناسک سکھا اور ہم پر رحم فرما۔ تو رحمت کرنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری اس نسل میں (جس کی ہم نے دعا کی ہے) انہی میں سے ایک (ایسا) رسول پیدا کر جو انہیں تیرے حکم پڑھ کر سنائے، قانون سکھائے (اس قانون کی) حکمت بتائے اور انہیں پاک کرے بے شک تو عزت دینے والا حکمت والا ہے۔)

کی دعا کا مصداق نہ ٹھہریں گے۔ پہلے نبیوں کی برکتوں کا مصداق بننا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ قریش کو اپنا مدد گار بنائیں ۔ پہلے سب نبی اپنی اپنی قوم کو دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور انہیں ساتھ ملا کر کام کرتے رہے ہیں ۔ اس لئے آپ کا بھی فرض ہے کہ اپنی قوم کو ساتھ ملائیں ۔ کیوں کہ کام کرنے کا طبعی طریقہ یہی ہے اس سے آپ کا طریقہ وہ ہو جائے گا جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آپ تک ایک ہی طرح قائم رہا۔ یعنی پہلے قومی انقلاب مکمل کرنا پھر اسے بین الاقوامی درجے تک کامیاب بنانے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ بھی اس طریق پر کام کریں تو؟ یہ طریقہ رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مستقل پروگرام بن جائے گا اگر آپ پہلے نبیوں کے طریق سے ہٹ کر طریقہ اختیار کریں تو وہ آئندہ انسانیت کے لئے تبدیل نہ ہو سکنے والا پروگرام نہ ہو گا۔ غرض حضرت نبی اکرم ﷺ یہی طریق اختیار کیا کہ پہلے اپنی قوم کو درست کیا اور انہیں اپنا دست و بازو بنایا۔ پھر ان کی مدد سے دوسری قوموں کے ایک ایک حصے کو ساتھ ملایا۔ پھر اس حصے نے اپنی اپنی قوم میں یہ انقلابی کام کیا اور قرآن حکیم کی تعلیم پھیلا کر اس انقلاب کی تکمیل کی۔ چنانچہ حضرت امام ولی اللہ دہلوی نے قوم بقوم اسلام پھیلنے کا جو طریق تاریخی طور پر ثابت کیا ہے اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ آج بھی جو قوم قرآن کے انقلاب کو بین الاقوامی درجے پر کامیاب بنانے کا تہیہ کرے وہ اسی طریق سے اسلام کی تعلیم کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ یہ تنظیم و تربیت ہی انقلاب کی روح ہے۔

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا (الفتح۔۳)

(اور اللہ مجھے زبردست مدد دے)

کل قومی حکومت تیری اس کمزور جماعت ہی کے ذریعے سے مہیا ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے ان غریب اور بے کس عربوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے تختے الٹ کر رکھ دئے۔ اور ان کی جگہ قرآن کا قانون چلایا۔ اس انقلاب کی بنیاد انسانی فطرت کی ضرورتوں پر تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ سب قوموں کے عقلمند لوگوں نے اسے مان لیا۔ اس طرح یہ تحریک روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ سب کچھ اس صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھا۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۵۳۸،۵۳۷)

☆

اب انقلاب عمومی حضرت محمد ﷺ ہی کی اتباع سے آسکتا ہے

حنیفی اولو العزم انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوشش کرتے رہے کہ تمام دنیا میں تورات کو پھیلا کر امامت کبریٰ (بین الاقوامی قیادت) حاصل کریں لیکن یہ مقام محمود حضرت محمد

مصطفیٰ ﷺ ہی حاصل کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انقلاب عمومی اپنے مختلف ادوار میں آپ کے اتباع سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو انقلاب رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا خاصہ ہے وہ ایک دن میں ساری دنیا میں نہیں پھیل سکتا۔ اس انقلاب کا پہلا حصہ وہ تھا جو خلافت راشدہ سے شروع ہو کر عباسی حکومت کے خاتمے تک کامیاب رہا۔ جب قریش میں اس انقلاب کو آگے بڑھانے کی طاقت نہ رہی تو اس انقلاب کے آگے بڑھنے کے لئے ایک اور قوم ایرانیوں کو ذریعہ بنایا گیا۔ لیکن قریش کے تنزل اور ایرانیوں کے عروج کا درمیانی وقفہ انقلاب کی "رات" تھی۔ اس میں نئی قوم تیار ہوئی۔ اس کے بعد ترکمانی قوموں نے اس انقلاب کو آگے بڑھایا اور پھر ہندوستانی قوم نے اسے اپنایا۔ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر یہ انقلاب ساری دنیا میں کامیاب رہا۔ ان ٹکڑوں کو علیحدہ علیحدہ خیال کرنا غلطی ہے۔ یہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں جب تک انسان روئے زمین پر قائم ہے، یہ انقلاب کسی نہ کسی شکل میں آگے بڑھتا رہے گا۔ اور آخر میں ایک ایسا زمانہ آسکتا ہے کہ تمام اقوام جو اس انقلاب سے مانوس ہو چکی ہوں ایک سطح پر آکر اس کے ماتحت مل جائیں۔ اس وقت یہ انقلاب عمومی، مکمل ہو گا۔

پس المزمل سے مراد وہ صاحب امامت کبریٰ ہے جس کے ماتحت تمام اقوام عالم جمع ہوں گی۔ یہ گویا الحاشر ہی کا دنیاوی مظہر ہے۔

المزمل کے دوسرے معنی: امام ائمہ انقلاب

(۲) اِزْمَلَ یا اِزْدَمَلَ کے دوسرے معنی ہیں حمَلَ بِمَرَّةٍ وَاحِدَةٍ (المنجد) (یعنی اونٹ کی طرح بوجھ اٹھا کر ایک ہی ہچکے سے اٹھ کھڑا ہوا)

اِزْدَمَلَهٗ :اِحْتَمَلَهٗ یعنی بوجھ اٹھالیا۔ (صراح) وَمِنْهُ قَوْلُهٗ تَعَالٰی یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّل یا ایھا المزمل بھی اسی معنی میں ہیں۔

رازیؒ نے عکرمہؒ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ مزمل کے معنی ہیں وہ شخص جس پر بھاری کام ڈال دیا گیا ہو۔ کیونکہ زَمَّل کے معنی ہیں حَمَلَ

یہ بار کیا ہے؟: قومی اور بین الاقوامی انقلاب

یہ بار جو نبی اکرم ﷺ نے اٹھایا قومی اور بین الاقوامی انقلاب کا بار تھا۔ اور تعجب یہ ہے کہ آپ نے پہلے اپنی قوم کو ترقی دے کر بین الاقوامی درجے کے کام کرنے والے کارکن تیار کرنے کا انتظار نہیں کیا۔ گو اگر آپ ایسا کرتے تو بھی کسی عقلمند کو اس پر اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ نے بین الاقوامی انقلاب کو موخر نہیں کیا۔ بلکہ دونوں کام ایک ہی وقت شروع کر لئے۔ یہ نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن آپ نے

جوانمردی، ہمت، محنت اور مشقت سے کام لیا اور پورے کے پورے بوجھ کو سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اللہ کے فضل سے بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ چنانچہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے قریش کی ذہنیت ایسی تیار کی کہ وہ جہاں امرائ مدینہ کے ساتھ مل کر کام کر سکے وہاں بلال حبشی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، صہیب رومی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اور سلمان فارسی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وغیرہ غیر عربوں کے ساتھ اور ان کے ماتحت بھی کام کر سکے۔

جو شخص سیاسی اجتماعیت میں اس قسم کا بار گراں اٹھاتا ہے وہ امام انقلاب کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم المزمل یعنی آخری درجے کے امام ائمہ انقلاب ہیں۔ مولانا محمد قاسم رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اس آخری درجے کا نام خاتم النبین رکھتے ہیں۔ اس سے اوپر کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۳۱۸،۳۱۷)

☆

مدثر کے معنی

موطا امام مالکؒ میں حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک نام الماحی بھی ہے جس کے معنی خود حضرت نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بتائے ہیں کہ: "یَمْحُو اللّٰہُ بِیَ الْکُفْرَ" (یعنی میرے ذریعے سے اللہ کفر کو محو کرے گا) چنانچہ لغوی طور پر دثر کے معنی اھلك (ہلاک کرنا) بیان کئے گئے ہیں جو بالکل الماحی کے معنوں کے مترادف ہیں۔ پس مدثر کے معنی ہیں دنیائے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم وجور مٹانے والا۔ نبی اکرم ایہ کام ملت حنیفیہ یعنی حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے اصول حیات کے دوبارہ زندہ کرنے سے کریں گے جو آپ کی گھٹی میں پڑی تھی، اور جس کے نمائندے قریش تھے۔

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت پر ایک نکتہ:

سیرت نبی (علیٰ صاحبھا التحیۃ والسلام) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ملت حنیفیہ ابراھیمیہ کے قیام کے لئے طبعاً بے تاب تھے۔ آپ کی تربیت بھی قریش کے اونچے گھرانوں میں ہوئی۔ جن میں اس ملت کی اچھی اچھی باتیں باقی تھیں۔ [1]

پھر وہ انقلاب کا زمانہ تھا۔ فارس اور روم آپس میں لڑ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی اقوام کو اپنے قبضے میں لائیں۔ ان سیاسی اور جنگی حالات کا اثر قریش پر بھی پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ان کے تجارتی تعلقات دونوں

---

[1] یہ خیال غلط ہے کہ قریش اور اہل عرب افریقہ کے وحشیوں کی طرح بالکل وحشی لوگ تھے جن میں کوئی انسانی خوبی باقی نہ رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قریش اور اکثر اہل عرب میں ملت حنیفیہ کا اچھا خاصہ حصہ باقی تھا۔ جیسے آج کل مسلمانوں کی تباہی کے باوجود ان میں اپنے بزرگوں کی بہت سی اچھی باتیں موجود ہیں تفصیل کے لئے دیکھو (حجۃ اللہ البالغہ ج اول ص ۱۲۴)

ممالک کے ساتھ تھے اور ان ملکوں میں ان کی کافی آمد و رفت تھی۔ چنانچہ قریش کا سمجھدار طبقہ سیاسی میلانات کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم ہو گیا تھا:

(۱) ایک طبقہ قیصر کی طرف مائل تھا۔

(۲) دوسرا طبقہ کسریٰ ایران کی طرف مائل تھا۔

(۳) تیسرا طبقہ دونوں سے الگ تھا اور حنیفیت پر قائم تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ طبعاً اس تیسرے گروہ کے سرگرم رکن تھے یہ گروہ اگرچہ اقلیت میں تھا لیکن عرب پر قریش کی سیادت قائم کرکے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ میں اس قسم کی قیادت کی طبعی خداداد استعداد بھی موجود تھی۔ آپ کو اس انقلاب میں کامیابی کے لئے جس ہدایت کی ضرورت تھی اور جس کے لئے آپ سرگرداں تھے (وَوَجَدَكَ ضَآلًّا)[2] وہ خداوند تعالیٰ نے فراہم کر دی (فَهَدٰى)[3]

آپ قرآن حکیم کے ذریعے سے دنیائے انسانیت میں جو انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ انسانی معاشرہ (سوسائٹی) میں سے ہر قسم کا ظلم خواہ وہ خدا اور بندوں کے تعلقات میں ہو یا فقط بندوں کے باہمی تعلقات میں یعنی روحانی ہو یا اقتصادی سب مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ خدا کے ساتھ صحیح طریق پر تعلقات قائم کئے جائیں گے اور انسانیت میں معاشیات، معاشرت اور اقتصادیات میں ایک نظم جدید پیدا کیا جائے گا۔ اس انقلاب میں کسی خاص قوم یا ملک کی خصوصیت نہ ہو گی۔ بلکہ وسیع ترین معنوں میں عالمگیر اور ہمہ گیر ہو گا۔

اسلام کا جامع انقلاب :

دنیا میں اب تک جو انقلابات ہوئے ہیں وہ سب کے سب جزوی انقلابات ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی عالمگیر اور جامع انقلاب نہیں ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آخری امام انقلاب ہیں۔ جن کی دعوت جامع عالمگیر انقلاب کے لئے ہے اور آپ نے اس جامعیت کا بہترین نمونہ سرزمین حجاز میں قائم کرکے دکھا دیا۔ جسے دنیا اب تک اس حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ آپ کے انقلاب میں اس وقت کی مہذب اقوام کا بیشتر حصہ آ گیا۔ اور سب کو خدمت انسانیت کے ایک نقطے پر جمع کرکے نہ صرف یہ کہ ان کے تعلقات ان کے خالق کے ساتھ درست کر دیئے۔ بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی درست کر دیئے۔ اب جب کبھی کوئی جماعت جامع بین الاقوامی انقلاب پیدا کرنا چاہے گی اسے آپ ہی کے نقش قدم پر چلنا

[2] اللہ تعالیٰ نے تمہیں سرگرداں پایا۔

[3] پھر ہدایت دی۔

ہو گا۔ جو جماعت اس لائحہ عمل کے خلاف کوئی اور لائحہ عمل لے کر اٹھے گی وہ یا تو سرے سے ناکام رہے گی یا صرف جزوی طور پر کامیاب ہو گی۔ چنانچہ فرانس، جرمنی، ٹرکی اور روس کے انقلابات اس اصول کی بین مثالیں ہیں۔ ان انقلابوں میں وہ جامعیت نہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے پیدا کردہ حجازی انقلاب میں تھی۔ جس نے بعد میں قیصر و کسریٰ کو بھی ہضم کر لیا۔

الغرض ہمارے نزدیک المدثر کے معنی ہیں "المهلك الكفر" یعنی انسانیت میں سے ہر قسم کا کفر (انکار) نکالنے والا وہ انکار خواہ خدا کے حقوق کے متعلق ہو یا انسانوں کے حقوق کے متعلق یہ انقلاب اسے انسانیت میں سے نکال باہر کرے گا۔

اس لفظ میں جو مبالغہ پایا جاتا ہے وہ حضرت نبی اکرم ﷺ کا طبعی اور فطرتی عزم و استقلال ظاہر کرتا ہے جو اس کفر کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے بارے میں ان کے دل میں پوشیدہ ہے۔

انقلاب میں اشاعت کی ضرورت :

(۲) قُمْ: (اٹھ)

یعنی اے وہ کہ تو دنیائے انسانیت سے ہر قسم کا ظلم اور کفر مٹانے کا تہیہ اور پختہ عزم کئے ہوئے ہے، ہم سے ہدایت لے اور محنت سے کام کر۔ اور جن لوگوں تک تیری آواز پہنچ سکتی ہے ان کو انسانی انقلاب کا یہ پیام سنادے۔ اور ایسے لوگ تیار کر جو یہ انقلابی تعلیم دوسرے لوگوں تک پہنچادیں۔ ایسے خاص لوگوں کی مرکزی قوت راتوں کو کھڑے ہو کر قرآن حکیم کی تعلیم پر تدبر کرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا ذکر سورۂ مزمل میں آچکا ہے۔ چنانچہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس شبانہ تعلیم نے وہ لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے اس انقلاب کو فارس اور روم تک پہنچادیا۔ اور پھر آگے وہ لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسے حبشیوں، ترکوں اور ہندیوں تک پہنچادیا۔ اب پھر یہ انقلاب پہلو بدل رہا ہے اور انشاءاللہ اس کی دعوت ہندوستان سے یورپ کی اقوام تک پہنچے گی۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۳۶۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال:

حضرت نبی اکرم ﷺ کی شاندار بین الاقوامی کامیابی اسی اصول طبعی کی پابندی کی رہین منت ہے۔ یہ اصول اس سے پہلے بھی برتنے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے بین الاقوامی مرکزیت کو توڑنے کے لئے اسی حربے سے کام لیا۔ جب خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت حنیفی کی ریاست سپرد کی (جو بین الاقوامی دعوت ہے) تو ان کو اور ان کے رفیق کار حضرت

ہارون علیہ السلام کو حکم دیا:

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۖ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۖ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ ۖ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (طٰہٰ ۴۷)

(یعنی دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم تیرے پروردگار کے پیامبر ہیں اس لئے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان کو عذاب مت دے! ہم تیرے پاس تیرے رب کی کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے ہیں۔ اب جو ہدایت کی پیروی کرے گا وہی سلامت رہ سکتا ہے۔)

چنانچہ خدا کے دونوں پیامبر فرعون کے پاس جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بطور نمائندہ گفتگو کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الاعراف ۷: ۱۰۵)

(میں یقیناً تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانی لے کر آگیا ہوں۔ اس لئے اب بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کردو)

بالکل ایسے ہی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قریش اور عرب میں بین الاقوامی کام کو قومی رنگ میں کرنا شروع کیا اور ان مظالم سے پاک کرنے کی کوشش کی جو وہ انسانیت پر کر رہے تھے۔ اور ان کو تعلق باللہ کا وہ سبق یاد دلایا جو وہ بھول چکے تھے۔

(۱۶) فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا (فرعون نے اس پیامبر کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اسے دردناک عذاب میں مبتلا کردیا)

فرعونی ملوکیت کا خاتمہ:

فرعون کی ملوکیت، بنی اسرائیل اور سب مصریوں سے ناجائز انتفاع (Exploitation) کر رہی تھی۔ اس نے ان کو غلامی کی انتہائی ذلالت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان سے اتنی محنت و مشقت لی جاتی تھی کہ ان کو بیلوں اور گدھوں کی طرح تمام گھریلو کاموں کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اہرام مصر (Paramids) جیسی عظیم الشان عمارتیں جن کی تعمیر میں لاکھوں من پتھر کی سلیں لگی ہیں سب مصریوں کے ہاتھوں بنوائی گئیں۔

جب حکمران طبقہ اپنی قوم کو یوں ذلیل بنائے تو اسے کیوں زندہ رہنا چاہئے؟ وہ تو اپنی قوم کو آدمی ہی نہیں مانتے! بنی اسرائیل کی ان کے ہاں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ فرعون نے بھی بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے ساتھ جانے دینے سے انکار کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو

آزادی کے پروگرام پر منظم کرلیا اور بالآخر ان کو مصر سے نکال لے گئے۔ اب خداوند تعالیٰ نے بھی بنی اسرائیل کی خاص مدد فرمائی۔ اور ان کے دشمنوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے برباد کردیا۔

چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ: کسریٰ اور قیصر

اسی طرح چھٹی صدی عیسوی کے فراعنہ (Pharoas) کسریٰ ایران اور قیصر روم۔۔۔۔ کے لئے ایک نبی عظیم ﷺ آیا جس نے ان کو دعوت دی کہ وہ اسلام کا قانون قرآن حکیم قبول کرکے اسے رائج کریں اگر وہ اس قانون کو رائج نہ کریں گے تو کسانوں پر جو ظلم وہ کررہے ہیں اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے۔
چنانچہ قیصر روم کو جو خط لکھا گیا اس میں یہ الفاظ خاص ہیں:
اِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِدَاعِيَةِ الْاِسْلَامِ، اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِيكَ اللهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ الْيَرِيْسِيْنَ
(الصحیح البخاری باب بدء الوحی)
(میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسے مان لوگے تو دنیا میں بھی بچ رہوگے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا دگنا اجر بھی دے گا اگر تم نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو تمہارے کسانوں پر جو مظالم ہو رہے اور وہ اپنی جہالت کے باعث جو غلطیاں کررہے ہیں ان کے تم ذمہ دار ہوں گے)
اس خط سے ظاہر ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کی انسان دوستی شروع ہی سے ملوکیت پرستوں کے جوئے تلے دبے ہوئے لوگوں خصوصاً کسانوں کے ساتھ تھی کیونکہ ان ممالک کی غالب آبادی ان کسانوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھی۔ چنانچہ امام الائمہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے حجتہ اللہ البالغہ (ص ۱۰۵) میں اس طبقے کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت عبرت انگیز ہے۔
کسریٰ و قیصر نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح فرعون کو دنیا میں سزا دی گئی اسی طرح یہ دونوں سلطنتیں صفحہ ہستی سے مٹادی گئیں۔ اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَهَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ (کسریٰ و قیصر ہلاک کردیئے جائیں گے اور ان کے بعد ان کا کوئی جانشین نہیں ہوگا)
یہ تھا بین الاقوامی انقلاب، جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے ذریعے سے پیدا کیا اور جس کا فائدہ تمام کمزور جماعتوں کو پہنچا۔
(۱۷) فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۖ
(۱۸) (الف) السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ: (تم کس طرح بچ سکو گے؟ اگر تم نے انکار کیا اس دن کا جو بچوں کو بوڑھا کردے گا اور جس سے آسمان پھاڑا جائے گا۔)
وہ یوم انقلاب آنے والا ہے اور جس طرح قیامت کبریٰ کا عذاب ایسا خوفناک ہوگا کہ بچے بوڑھے

ہو جائیں گے اور آسمان پھٹ جائیں گے اسی طرح چھوٹے پیمانے پر آنے والے ایام انقلاب میں تمام مخالفین کو سخت سزادی جائے گی۔ اس یوم انقلاب کے لانے کے لئے خدائے قدیر اور مدبر السموت والارض تدابیر کر رہا ہے۔ اگر اسے قریب ترلانے کے لئے آسمانی قوتوں کو پھاڑنا(یا بقول حضرت مسیح علیہ السلام "بلانا") پڑے گا تو وہ بھی کر ڈالے گا۔

انقلاب کے لئے تدبیر الٰہی کے طریقے :

تبدیر الٰہی کے انہی اصول کار کی تشریح کرتے ہوئے امام ولی اللہ فرماتے ہیں:

وَإِذَا تَهَيَّأَتْ أَسْبَابُ هٰذَا الشَّرِّ اِقْتَضَتْ رَحْمَةُ اللّٰهِ بِعِبَادِهٖ وَلُطْفُهٗ بِهِمْ وَعُمُوْمُ قُدْرَتِهٖ عَلَى الْكُلِّ وَشُمُوْلُ عِلْمِهٖ بِالْكُلِّ اَنْ يَّتَصَرَّفَ فِيْ تِلْكَ الْقُوٰى وَالْاُمُوْرِ الْحَامِلَةِ لَهَا بِالْقَبْضِ وَالْبَسْطِ وَالْاِحَالَةِ وَالْاِلْهَامِ حَتّٰى تَقْضِيَ تِلْكَ الْجُمْلَةُ اِلَى الْاَمْرِ الْمَطْلُوْبِ

یعنی جب عارضی قباحت کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی مہربانی تقاضا کرتی ہے کہ اس عارضی قباحت کو دور کر کے مصلحت عامہ کے مطابق حالت پیدا کر دی جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے مشکل نہیں ہے اس لئے کہ وہ ہر چیز پر براہ راست قادر ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اس غرض کے لئے وہ مخلوقات اور ان کی قوتوں میں تصرف کرتا ہے اس کے تمام تصرفات چار قسموں میں منقسم ہو جاتے ہیں:

(۱) قبض: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے خلاف ہوں ان کی قوت عاملہ روک دی جاتی ہے)
(۲) بسط: (یعنی جو قوتیں مصلحت کلیہ کے لئے مفید ہوں مگر کمزور ہوں ان کو قوٰی مثالیہ سے مدد پہنچا کر طاقتور بنادیتا ہے)
(۳) احالہ: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کی غرض سے اگر ضرورت پڑے تو ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے)
(۴) الہام: (یعنی مصلحت کلیہ کے قیام کے اصول کی محبت یا اس کے مخالف قوتوں کی نفرت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے اور وہ اس کے حق میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

کسریٰ و قیصر اور ان کے متبع میں قریش کو انذار:

الغرض ان تدابیر کے ذریعے سے قرآنی انقلاب لایا جائے گا اور کوئی قوت اسے روک نہ سکے گی اور نہ حجاز میں کوئی غیر انقلابی رہنے پائے گا۔ اب اگر فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحریک انقلاب کی مخالفت کر کے بچ نہ سکا تو قیصر و کسریٰ اور ان کے مکی اور حجازی متبعین اس انقلاب سے جو قرآن حکیم لانے والا ہے

کس طرح بچ سکتے ہیں؟

اس پیشگوئی کی تصدیق:

تاریخ شاہد ہے کہ یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح نکلی اور اس اعلان کے تیرہ سال کے بعد جنگ بدر میں ابو جہل اور اس کے متبعین اور چند سال کے بعد ایرانی اور رومی جنگوں میں کسریٰ ایران اور قیصر روم ہلاک ہو گئے۔

(ب) كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا: (یہ بات ہو کر رہنے والی ہے) یہ انقلاب ہو کر رہے گا اور کوئی طاقت اسے روک نہ سکے گی!

یہ اعلان جنگ بدر سے تیرہ سال پہلے کیا گیا تھا۔ اور بدر میں عین اس کے مطابق ہو کر رہا۔

انقلاب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت:

ہمارے اکثر مفسرین نے اپنی تفسیریں اس زمانے میں لکھیں جب قرآنی انقلاب دنیا کے اکثر حصوں پر چھا چکا تھا اور قرآنی نظام (Quranic Order) کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کی تنظیم ہو چکی تھی اس لئے یہ مفسرین انقلاب کی وہ کیفیت سمجھنے سے معذور رہے جو صدر اسلام میں پیش آئی تھی اور جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں نے واقعۃً زندگی بسر کی۔ اس لیے یہ مفسرین اکثر واقعات کو جو انقلاب کے زمانے میں پیش آیا کرتے ہیں اور جو واقعی قیامت کبریٰ کا نمونہ ہوتے ہیں، قیامت کبریٰ ہی پر محمول کر کے خاموش ہو گئے۔ اس انقلاب کی حقیقت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس قسم کا انقلاب دیکھا ہو۔

(قرآنی شعور انقلاب ص۳۴۶،۳۴۱)

☆

سورۂ فتح کا مرکزی واقعہ

سورۂ فتح میں صلح حدیبیہ کے واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ ذی قعدہ ۶ ہجری میں حضرت نبی اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ گویا آپ اور مسلمان مکہ مکرمہ پہنچ گئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں۔ اس خواب کی کیفیت سن کر غریب الوطن مسلمان جو عرصے سے خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے بے تاب تھے اور بھی بے چین ہو گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ بھی عمرہ کے لئے جانے پر تیار ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کی جماعت ذی قعدہ ۶ ھ میں

مدینہ منورہ سے نکلی۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ پندرہ سو صحابہ تھے۔(رضوان اللہ علیہم اجمعین) جن میں کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحلیفہ کے گاؤں پہنچے تو آپ نے عمرے کا احرام باندھا اور قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی کو بطور جاسوس بھیجا کہ قریش کی خبر لائے۔ چنانچہ جب آپ عسفان کے قریب پہنچے تو وہ سکاؤٹ واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ قریش آپ کو روکنے اور آپ سے لڑنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔

جب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے گھر سے نہیں نکلے لیکن اگر کوئی ہمیں بیت اللہ (کعبہ) تک پہنچنے سے روکے گا تو اس سے لڑیں گے۔ یہ سن کر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور کچھ دور جاکر آپ نے فرمایا کہ خالد بن ولید غمیم میں ہے ہم دائیں کو ہو چلیں۔ یہاں تک کہ آپ اپنی جماعت سمیت اس وادی تک پہنچ گئے جہاں سے مکہ کو جاتے ہیں۔ یہاں آپ کی اونٹنی یکایک ٹھہر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر قریش مجھ سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمات کی تعظیم ہوتی ہو تو میں ان کی بات مان لوں گا۔ آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر اترے یہاں سے مکہ صرف ۱۹ میل تھا۔

یہاں سے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان کو سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تاکہ انہیں خبر دیں کہ مسلمان صرف عمرہ ادا کرنے آئے ہیں ساتھ ہی انہیں ہدایت کر دی کہ مکہ مکرمہ میں جو مسلمان چھپے چھپے رہتے ہیں ان سے بھی ملیں۔ اور انہیں فتح کی خوشخبری دیں اور انہیں اطمینان دلادیں کہ مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا اور کسی کو اپنا ایمان چھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ چنانچہ حضرت عثمان بلوح کے مقام پر قریش کی جماعت سے ملے اور پھر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

اس اثناء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں پر اس خبر کا اثر پڑ سکتا تھا۔ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیکر کے ایک درخت کے نیچے تمام حاضرین سے اس امر پر اقرار لیا کہ اگر اب لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہیں گے۔ مسلمانوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی۔ سب سے پہلے حضرت ابوسنان الاسدی نے بیعت کی۔ ایک صحابی حضرت سلمہ بن اکوع نے تین مرتبہ بیعت کی یعنی شروع میں، بیچ میں اور آخر میں۔

یہ خبر سن کر قریش کے ہوش جاتے رہے اور انہوں نے صلح کے لئے آدمی بھیجے۔ آخر ان باتوں پر صلح ہو گئی۔

(۱) یہ صلح دس سالوں تک رہے گی۔

(۲) جو قبیلے قریش سے ملنا چاہیں، قریش سے مل جائیں اور جو مسلمانوں سے ملنا چاہیں مسلمانوں سے مل جائیں۔

(۳) مسلمان ابھی واپس جائیں اور اگلے سال کعبہ کا طواف کر لیں۔

(۴) اگر مکہ والوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہو کر نبی اکرم ﷺ کے پاس چلا جائے تو اسے قریش کے طلب کرنے پر واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان قریش میں چلا گیا تو اسے واپس نہیں دیا جائے گا۔

اس شرائط پر ابھی بحث ہو رہی تھی کہ مسلمان ابو جندل رضی اللہ عنہ بن سہیل مکہ سے آیا اور تمام مسلمانوں کے سامنے گر گیا۔ قریش کے سفیر نے معاہدے کی شرط کے مطابق اسے طلب کیا حالانکہ ابھی اس شرط پر بحث ہو رہی تھی۔ اس آخری شرط سے سب مسلمان سوائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سخت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کی ترجمانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی۔ آپ نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ "یارسول اللہ کیا آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا یقینا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ "کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن ناحق پر نہیں ہیں؟" آپ نے فرمایا یقیناً۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟" آپ نے فرمایا کہ "کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی ہی سال کریں گے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ "نہیں"۔ تو آپ نے فرمایا کہ "یقین رکھو ہم ضرور یہاں آئیں گے اور طواف کریں گے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی باتیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی کیں۔ حضرت صدیق اکبر نے بھی وہی جوابات دے ئے، جو آنحضرت نے دیئے تھے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ آنحضرت جو بات فرمائیں اسے مرتے دم تک بے چون و چرا مانتے رہو۔ غرض یہ شرط منظور ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کو قریش کے سفیر کے حوالے کر دیا۔ اور ابو جندل رضی اللہ عنہ نے صبر کے ساتھ اپنی مصیبت کو قبول کر لیا۔ اور تمام مسلمان یہ تلخ گھونٹ پی کر بھی چپکے ہو رہے۔

ابھی حضرت نبی اکرم ﷺ حدیبیہ ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اسی (۸۰) آدمی کوہ نعیم سے صبح کے وقت اس ارادے سے اترے کہ مسلمانوں کو نماز کی حالت میں قتل کر دیں۔ یہ سب لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن آنحضرت نے انہیں معاف کر کے رہا کرا دیا۔

اس معاہدے کے بعد آپ حدیبیہ سے مدینہ منورہ کو واپس تشریف لے گئے۔ راستے میں سورہ فتح کے شروع کی آیتیں اتریں۔

ترجمہ: ہم نے تجھے کھلی فتح دی اور تیری پہلی لغزشیں اور پچھلی لغزشیں معاف کر دیں اور اپنی نعمت تجھ پر تمام کر دی اور (یہ کہ وہ) سیدھی راہ کی طرف تیری راہنمائی کری اور تجھے زبردست مدد دی۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ کیا یہ فتح ہے؟ (یعنی حدیبیہ کا صلح نامہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں یہی چیز ہے جسے فتح قرار دیا گیا ہے۔

آپ مدینہ منورہ میں ذی الحجہ کے شروع میں واپس تشریف لے آئے۔ یہاں کوئی تین ہفتے ٹھہرے ہوں گے کہ محرم میں خیبر پر چڑھائی کردی۔ اس معرکے میں صرف ان مسلمانوں کو شامل ہونے کی اجازت تھی جو حدیبیہ کے واقعے میں شریک رہ چکے تھے۔

صلح کا نتیجہ اور اثر:

اس صلح کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں اور ان کے مخالفوں میں راہ و رسم بڑھا اور میل جول زیادہ ہوا تو اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کے بادل چھٹنے لگے اور لوگ مسلمانوں کے اچھے سلوک سے اثر لے کر مسلمان ہونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی چوتھی شرط کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ مخالفین میں سے جو شخص مسلمان ہو کر شرط کے مطابق مخالف کیمپ میں بھیجا جائے گا، وہ ضرور وہاں بھی اپنا کام کرتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے عین معاہدہ لکھے جانے کے وقت قریش کے حوالے کر دئے گئے۔ انہیں مکہ معظمہ لے جاکر قید کر دیا گیا۔ لیکن جو شخص ان کی نگرانی پر مقرر ہوتا۔ وہ ان کے سمجھانے سے مسلمان ہو جاتا۔ اب دونوں مل کر تلقین کرتے۔ اس طرح ان قیدیوں کی تلقین سے تین سو کے قریب آدمی مسلمان ہو گئے۔ قریش مکہ نے بہتیرا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاہدے کی اس شرط کو توڑ کر ان مسلمانوں کو اپنے ہاں لے لیں۔ لیکن آپ نے معاہدہ توڑنا قبول نہیں فرمایا۔ آخر قریش کو خود ہی ان مسلمانوں کو مکے سے نکال دینا پڑا۔

حدیبیہ میں اسلامی جماعت کے ضبط کا حال اوپر بیان ہو چکا۔ یہ لوگ تو آنحضرت کے سامنے تھے لیکن حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ آپ سے دور ہوتے ہوئے بھی جماعتی ضبط کے اتنے پابند نکلے کہ جب مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے قرار دیا کہ ابوجندل رضی اللہ عنہ نے ابوالعاص مکی کے جس قافلے کو لوٹا ہے اس کا مال اسے واپس کر دیں تو انہوں نے اس فیصلے کی اطلاع پاتے ہی ابوالعاص کے قافلے کا سارا اسباب یہاں تک کہ رسی اور اونٹ کی مہار تک ابوالعاص کے حوالے کردی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ابوالعاص نے سارا مال حقداروں تک پہنچا کر اسلام قبول کر لیا۔

غرض اس صلح کے نتیجے کے طور پر لوگ کثرت سے اسلام لانے لگے۔ چنانچہ جہاں حدیبیہ کے واقعے میں آنحضرت کے ساتھ پندرہ سو آدمی تھے وہاں ایک سال بیچ دے کر اگلے سال فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار "قدوسی" تھے۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ اب مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کے بادل چھٹ رہے تھے۔ گویا اس صلح نے اسلام کی فتح کا دروازہ کھول دیا۔

(قرآنی شعور انقلاب ص ۵۲۱،۵۲۵)

اختتامیہ

اظہار رسالت عہدِ حاضر میں

پیغمبر اسلام ﷺ کو خصوصی طور پر اظہار* کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے دین کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب و سربلند ہو۔ یہی نسبتِ غلبہ آپ کی امت کو بھی حاصل ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا کہ ڈھائی ہزار سال کے ایک خصوصی منصوبہ کے ذریعہ وہ اسباب فراہم کئے جن کو استعمال کر کے آپ دین خدا کو غالب و ظاہر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ آپ ﷺ کی امت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ موافق حالات کامل طور پر فراہم کر دئے ہیں جو دور جدید میں اسلام کے غلبہ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ پیغمبر کے امتی اگر ان موافق حالات کو حکمت اور صبر کے ساتھ استعمال کریں تو خدا کا وعدۂ نصرت دوبارہ پیغمبر کے امتیوں پر اسی طرح واقعہ بن سکتا ہے جس طرح وہ خود پیغمبر کے اوپر واقعہ بنا تھا۔

امریکہ سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے: انسان اور اس کے معبود (Man and his Gods) اس کتاب میں مختلف مذاہب پر مقالے ہیں۔ اسلام پر جو مقالہ ہے، اس کے عیسائی مقالہ نگار نے اسلامی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے عظیم نتائج کے بارے میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ”اس کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:“

(Its advent changed the course of human history (p.389)

یہ ایک مستشرق کی زبان سے اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ان تبدیلیوں کا اعتراف ہے جنھوں نے تاریخ میں ایسے دور رس امکانات کھولے جن کے بعد اسلام کو غیر اسلامی ادیان پر غالب و برتر کرنا اسی طرح آسان ہو گیا ہے، جس طرح بارش آجانے کے بعد کھیت سے فصل اگانا۔

پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کے ذریعہ جو انقلاب برپا کیا گیا وہ اگرچہ اصلاً توحید اور آخرت کی فکر پر مبنی ایک دینی انقلاب تھا۔ لیکن اس نے بہت سے دور رس دنیوی نتائج بھی پیدا کئے۔ آپ

---

* لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ (توبہ۔۳۳)

کے لائے ہوئے انقلاب کے دنیوی نتائج میں سب سے اہم وہ نتائج ہیں جنہوں نے قدیم زمانہ کے سماجی اور اجتماعی نظام کو اس طرح بدل دیا کہ وہ حالات ہی ختم ہو گئے جن میں دعوت حق کا کام ایک انتہائی مشکل کام بنا ہوا تھا۔

سورہ براءۃ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تاکہ وہ اعلان کر دیں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج بیت اللہ کی اجازت نہ ہو گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حج کے اجتماعات میں بلند آواز سے اس کا اعلان کرتا پھرتا تھا، یہاں تک کہ میری آواز بھاری ہو گئی (فکنت انادی حتی صحل صوتی، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۱۲۴) مگر آج لاؤڈ اسپیکر و دیگر وجود میں آنے کے بعد یہ مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اعلان حق کا کام کتنا زیادہ آسان ہو چکا ہے۔

دین کی دعوت کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان امتوں پر ڈالی گئی جن کے پاس وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن میں استحفاظت (طلب حفاظت) کا لفظ آیا ہے

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (المائدہ۔۴۴)

(کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس (کے حکموں اور ہدایتوں) پر گواہ تھے)

مگر قرآن کی حفاظت کے بارے میں فرمایا گیا کہ خدا نے اس کتاب کو اتارا ہے اور وہی اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر۔۹)

(بلاشبہ خود ہم نے "الذکر" (یعنی قرآن کہ سر تا پا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ساتھ خدا کا یہ منصوبہ تھا کہ شرک کو مغلوب کیا جائے اور توحید کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے (الانفال ۳۹) یہ کام اتنے مختلف اسباب کی مساعدت چاہتا ہے جو صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ موافق حالات پیدا کئے جن کو استعمال کر کے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں سے جو انقلاب آیا اس کے بعد شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں چھا سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید والوں نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ اس بار یہ

واقعہ 'الحاد' کے ہاتھوں سے ہوا۔ چنانچہ آج کی دنیا میں الحاد نے غالب فکر کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ بے خدا ذہن یا سیکولر ذہن آج دنیا کا غالب ذہن ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا ذہن عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یقینا معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر غلبہ توحید کی جدوجہد کے لئے موافق زمین کا کام کرسکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا غلبہ ہے مگر وہ موافق حالات پوری طرح پیدا ہوچکے ہیں جن کو استعمال کرکے دوبارہ توحید کو غالب فکر کا مقام دیا جاسکے۔

ا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تقریباً چار ہزار سال پہلے قدیم عراق کے دارالسلطنت (اُر) کے لوگوں کو پکارا کہ ایک خدا ہے جس کا حکم اور بندگی ہے، جو نفع و نقصان کا مالک ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اسی لئے تم اسی سے حاجتیں مانگو اور اسی کی پرستش کرو۔ اس دعوت توحید کے خلاف اس وقت کے مشرک بادشاہ نمرود کلدانی نے اتنا سخت رد عمل ظاہر کیا کہ آپکو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا۔

آج بھی دنیا کے ہر ملک میں شرک کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لیکن آج آپ کسی ملک میں دعوت ابراہیمی کو لے کر اٹھیں تو موجودہ زمانہ کا کوئی حکمران آپ کے ساتھ اس قسم کا شدید سلوک نہیں کرے گا۔

اس کی وجہ فلسفۂ حکومت کی تبدیلی ہے۔ نمرود کے زمانہ میں شرک ایک سیاسی عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کہ آج وہ صرف ایک محدود مذہبی عقیدہ ہے۔ قدیم زمانہ میں عام طور پر مشرکانہ نظریۂ سیاست دنیا میں رائج تھا۔ نمرود، دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کی طرح، اسی قسم کے نظریہ کی بنیاد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہے، اس لئے وہ دوسروں سے برتر ہے اور اس کو دوسروں کے اوپر حکمرانی کرنے کا فوق الفطری حق حاصل ہے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے حکمراں اس قسم کے نظریہ حکومت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انہوں نے عوامی رائے کی بنیاد پر اپنے لئے حکمرانی کا حق حاصل کیا ہے نہ کہ کسی فق الفطری عقیدہ کی بنیاد پر۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت میں موجودہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے لئے کوئی چیلنج نظر نہیں آتا۔ جب کہ نمرود اور دور قدیم کے دوسرے بادشاہوں کو توحید کا عقیدہ پھیلنے میں اپنی سیاسی جڑ کٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

قدیم زمانہ میں جب کوئی پیغمبر اٹھتا تو اکثر پہلے ہی مرحلہ میں وقت کے اقتدار سے اس کا ٹکراؤ شروع ہوجاتا اور غیر ضروری قسم کی مشکلات اس کی راہ میں حائل ہوجاتیں۔ اس کی وجہ سیاسی ادارہ کے ساتھ فوق الطبیعی عقائد کی یہی وابستگی تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ عوام کو یہ یقین دلاکر ان کے اوپر حکومت

کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، خدا ان کے اندر حلول کر آیا ہے۔ ایسے ماحول میں جب توحید کی آواز بلند ہوتی تو ان کو نظر آتا کہ وہ ان کے سیاسی استحقاق کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ یہ اعتقادی پیچیدگی ان کو داعی حق سے ٹکرا دیتی تھی۔ اسلام نے ثابت کیا کہ ہر قسم کی فوق الفطری حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں، ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس طرح اسلام نے سیاسی ادارہ کو اعتقادیات سے جدا کر دیا۔ اب حکومت کرنے کا حق کسی کو عوامی رائے سے ملتا تھا نہ کہ خدا سے کسی قسم کے پُراسرار رشتہ کی بنیاد پر۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے قدیم زمانہ میں کچھ لوگ یہ بات مشہور کر کے اپنا طبی کاروبار چلاتے تھے کہ انہوں نے ایک جن کو مسخر کر رکھا ہے اور وہ ان کے پاس آکر ان کو فن طب کے رموز بتا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی شخص یہ آواز بلند کرے کہ علم طب میڈیکل کالج میں سکھایا جاتا ہے نہ کہ جنات کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو مذکورہ قسم کے طبیب ایسے شخص کے سخت مخالف ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو ایسی تحریک سے کوئی عداوت نہ ہوگی۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ تاریخ کا رخ موڑنے کا علم ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا۔ اب وہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دین کے داعیوں کے لئے اب خود انسانی اسلحہ خانہ میں ہر قسم کے تائیدی اسباب موجود ہیں۔ جدید قانونی اور سماجی تبدیلیوں نے اب اس کا موقع دے دیا ہے کہ دعوت دین کا کام کھلے طور پر کیا جائے اور کوئی فرعون یا نمرود اس کا راستہ روکنے کیلئے میدان میں موجود نہ ہو، حقائق کی دنیا جو اب انسان کے علم میں آئی ہے اس نے ایسے دلائل جمع کر دئے ہیں جو دین کی صداقت کو خالص علمی طور پر ثابت شدہ بنا سکیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک عظیم فکری انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب وہی ہے جس کو عام طور پر سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی اور لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبۂ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے پچھلے زمانوں میں تلوار اٹھانی پڑتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی انقلاب زمانۂ رسالت کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر آخر الزماں کے لائے ہوئے انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنہوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔ تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مفادات و مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں اور اغراض کا محور نظر آئی اسی کو انسان نے اپنے غرض کا خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پر ستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جا سکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے؟ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات و قیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب اپنی اوریجن کی تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمران ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو

خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخر سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنادیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ آپ ہی آپ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھادیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کو بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کر سکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا

دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے ہر سطح پر انسانی غلامی اور بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرادیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنادیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن مانیٹ اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں ۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جا سکتا ہے۔

یہ مواقع جو عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبہ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔ (مولانا وحید الدین خان)

اس غلبہ کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ قرآن کے ان پہلے مخاطبین کے سامنے روایات کا مسخ شدہ دین نہیں تھا بلکہ قرآن کی ہدایت ان کا اصل الاصول تھی۔ انہوں نے توحید کے عظیم تصور کو صرف غیر اللہ کے سامنے ماتھا نہ ٹیکنے کا پیغام نہیں جانا بلکہ توحید کے تصور عظیم سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا

عبدیت اور غلامی کے تمام تصورات کو خاتمہ یقینی بنایا۔ اور ہر سطح پر انسانی آزادیوں کی داغ بیل ڈال دی۔

اس طرح توحید میں اللہ تعالیٰ کی عبدیت کے ساتھ اس کی ربوبیت اور اس کی حاکمیت کے تصورات پر قرآنی ہدایات کے عین مطابق عمل پیرا ہوئے۔ اس طرح انسانی کو معاشرت و اقتصاد کی بے مثال فیض رسانی ہوئی انہوں نے دنیا کو باطل قرار دیکر آخرت کی تیاری کا سامان نہیں بنایا بلکہ قرآن کی ہدایت کے مطابق حسنۃ فی الدنیا۔ دنیا کی حسنا کیوں سے حسنۃ فی الآخرت کا سامان تیار کیا۔ انہوں نے استخلاف فی الارض یعنی زمین پر خدائی خلافت کا ایسا مثالی نمونہ قائم کیا کہ انسانی فلاح و کامرانیوں کے میدان میں آئندہ کی انسانیت کیلئے شاندار روایتیں قائم ہو گئیں۔

اب بھی قرآن حکیم کے بتائے ہوئے توحید کے انہی تصورات سے جن کو پیغمبر اسلام ﷺ اور اس کی جماعت نے اختیار کر کے بڑی عالمی تبدیلیوں کی بنیاد ڈالی، اس مضطرب و مسائل میں گھری ہوئی دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔ (مرتب)